تاریخ کی روشنی

ڈاکٹر مبارک علی
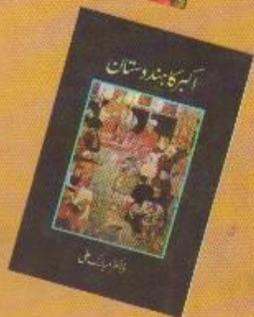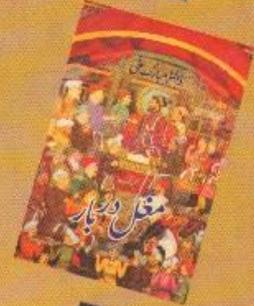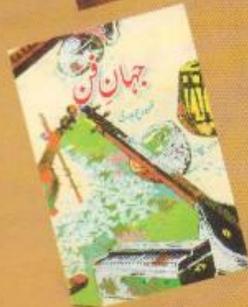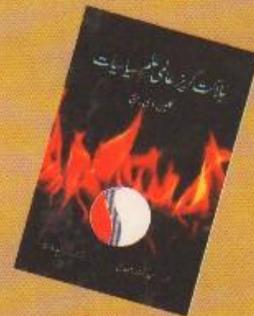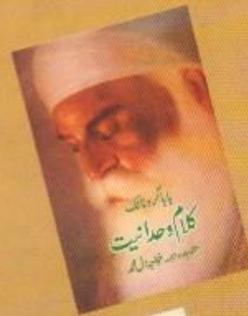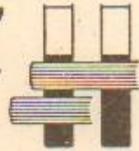
فکشن ہاؤس
18-مزنگ روڈ لاہور
فون: 7249218-7237430
E-mail:FictionHouse2004@hotmail.com

نام کتاب : تاریخ کی روشنی
مصنف : ڈاکٹر مبارک علی
پبلشرز : فکشن ہاؤس
18- مزنگ روڈ، لاہور
فون:7249218-7237430
اہتمام : ظہور احمد خاں
کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز : حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور
سرورق : عباس
پہلا ایڈیشن : 1990ء
دوسرا ایڈیشن : 1993ء
تیسرا ایڈیشن : 2005ء
قیمت : -/120 روپے

فہرست

دیباچہ

اس وقت پاکستانی معاشرہ کی جو صورت حال ہے، اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہم نے اپنے لئے جو راستہ منتخب کیا تھا، وہ ہمیں پس ماندگی، جہالت اور اندھیرے کی جانب لے جا رہا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر ہم نے وقت کا ساتھ نہیں دیا، اور عالمی اقدار کو نہیں اپنایا، تو اس صورت میں ہم دنیا سے کٹ کر اور نیچے کی طرف گرتے چلے جائیں گے۔ ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ یہ زمانہ جمہوری اور سیکولر اقدار کا ہے کہ جس میں معاشرے کے ہر فرد کو مساوی حقوق ملتے ہیں اور انہیں مذہب، نسل، یا زبان کی بنیاد پر ثانوی درجہ نہیں دیا جا سکتا ہے، ایک مضبوط اور مستحکم معاشرہ جب ہی قائم ہوتا ہے کہ جب اس میں ہر فرد کو برابر کے حقوق ملیں۔

یہ حقوق سے محرومی ہے کہ جو اقلیتوں اور افراد کو تشدد اور بے حسی کی جانب لے جاتی ہے، اور جب خود ریاست تشدد کے ہتھیاروں کو استعمال کر کے، اذیت، قید و بند، اغوا، رشوت، اور قتل کے ذریعہ اپنا تسلط قائم کرنا چاہتے تو پھر یہی ماڈل سیاسی جماعتیں بھی اختیار کر لیتی ہیں، اس لئے سب سے پہلے ریاست کو تشدد ترک کرنا چاہئے اور دہشت و خوف کے، عوامل کو ختم کرنا چاہئے، اس کے بعد ہی لوگوں میں اس پر اعتماد ہو گا۔

تاریخ چونکہ انسان کا بحیثیت مجموعی مطالعہ ہے، اس لئے اس میں سیکھنے کو بہت کچھ ہے، لیکن سیکھنے کے لئے ذہن کو کھولنا پڑے گا، اور اپنے تعصبات کو دور کرنا ہو گا، اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ جب ذاتی مفادات کی جگہ قومی مفادات کو اہمیت دی جائے۔

کتاب کے آخر میں لنڈن کے دو مضامین کچی آبادی پر ہیں، اگرچہ انہوں نے یہ تجزیہ کچی آبادی کو مد نظر رکھ کر کیا ہے، مگر اس میں ہمارے پورے معاشرے کی ذہنیت اور اس کا عمل جھلکتا ہے، اور ان خرابیوں کی نشاندہی ہوتی ہے کہ جو ہمارے ہاں عام ہیں، اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

آخر میں ظہور احمد خان اور رانا عبدالرحمان کا مشکور ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی اشاعت میں دلچسپی لی، ورنہ کتابیں چھاپنا اور علم پھیلانا آج کل معیوب سمجھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی

اکتوبر ۱۹۹۴ء

لاہور

تاریخ کا استعمال

جب کبھی کسی معاشرے میں انتشار ہوتا ہے اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہونا شروع ہو جاتا ہے تو اس وقت اگر تاریخ کی مدد لی جائے تو وہ اس زوال کے عمل کو روک سکتی ہے اور معاشرہ کے مختلف گروہوں اور جماعتوں کے درمیان ثقافتی اور سماجی روابط کو تلاش کر کے انہیں یک جہتی کے مواقع فراہم کر سکتی ہے۔ قومیت کا نظریہ صرف ایشیا و افریقہ کے نئے آزاد ہونے والے ملکوں کے لئے ہی ضروری نہیں بلکہ یہ ان ملکوں کے لئے بھی ضروری ہے جو ترقی یافتہ ہیں۔ اور جن کی بنیادیں مضبوط ہیں۔

اکثر پسماندہ ملکوں میں حکمران طبقے لوگوں کی توجہ مسائل سے ہٹا کر ان میں وطن پرستی کی تبلیغ کرتے ہیں تاکہ وہ محرومیوں کو بھول جائیں اور اپنے حقوق کا مطالبہ نہیں کریں۔ بلکہ اپنی اذیتوں اور دکھوں کے ساتھ وہ ان کی مراعات کے تحفظ کے لئے جدو جہد کریں اور ان کے دفاع میں اپنی جانیں بھی قربان کر دیں۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ ہماری تاریخ میں ماضی کی جو تشکیل کی جاتی ہے تو اس میں فاتحین' جرنیلوں اور لوٹ مار کرنیوالوں کی تعریفیں ہوتی ہیں۔ اور دانشوروں' سائنسدانوں اور ادیبوں و شاعروں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ماضی کی یہ تشکیل اس لئے بہت اہم ہے کہ اس سے قوموں کے راستے متعین ہوتے ہیں کہ یا تو وہ دہشت پسندی' مخالفت' اور تشدد کا راستہ اختیار کریں' یا امن و امان اور محبت کا۔ تشدد و طاقت کا راستہ ہمیشہ آمریت اور مطلق العنانیت کی جانب لے جاتا ہے جب کہ امن و امان اور مفاہمت جمہوری روایات اور یک جہتی کی ثقافت کو پروان چڑھاتے ہیں۔

ہمارے سامنے جرمنی کی مثال ہے کہ جس نے بسمارک اور قیصر ولیم کی روایت کو اختیار کیا اور لیپ کنیخت اور ہیل کے نظریات کو نظر انداز کر دیا جس کا نتیجہ نازی ازم کی شکل میں نکلا کہ جس نے بالآخر جرمنی کو تباہی کا راستہ دکھایا۔

تاریخ کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اس وقت برطانیہ اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک بھی اس کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ ان کے موجودہ مسائل کو حل کیا جا سکے' اور وہ عالمی سطح پر جو جرائم کر رہے ہیں انہیں چھپایا جا سکے۔ برطانیہ کی سابق وزیراعظم مارگریٹ تھیچر نے برطانوی مورخوں پر زور دیا کہ وہ ایسی تاریخ نہ لکھیں کہ جس سے برطانیہ کے کردار پر آنچ آئے' کہ جس میں افسردگی و غم ہو' کہ جس میں نا امیدی

و مایوسی ہو' اس کے بجائے ایسی تاریخ لکھنی چاہئے کہ جس میں حوصلہ ہو' اعتماد ہو' یہی بات امریکہ کے سیکرٹری آف ایجوکیشن نے کہی تھی کہ تاریخ ہی وہ آخری چیز ہے جو قوموں میں قوم ہونے کا احساس پیدا کرتی ہے۔

پاکستان میں تاریخ کو کس طرح سے استعمال کیا جائے کہ اس سے لوگوں میں قومی شناخت پیدا ہو؟ اگر دیکھا جائے تو صرف تاریخ تنہا یہ کام نہیں کر سکتی ہے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ معاشرہ کا نظام بدلے' اور لوگوں کی بنیادی ضرورتیں کہ جس میں رہائش' تعلیم اور صحت انتہائی اہم ہیں وہ پوری ہوں اس وقت تاریخ لوگوں میں قومی شعور کو بیدار کرنے میں موثر ہو گی۔ اگر یہ مسائل موجود رہے تو یہ ممکن نہیں کہ محض لوگوں کے جذبات کو ابھار کر انہیں اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنے دکھوں اور محرومیوں کو بھول جائیں اور اپنے استحصال کرنےوالوں کے ہاتھوں کو مضبوط کریں۔

پاکستان کے لئے یہ سوال بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ ہم کن بنیادوں پر قوم کی تشکیل کے عمل کو شروع کریں؟ کیا لوگوں کے جذبہ حب الوطنی کو ابھار کر' یا انسان دوستی کے نظریات پر' اگر ہمیں انسان دوستی کی راہیں اختیار کرنی ہیں تو اس صورت میں ہمیں تاریخ کے نقطہ نظر کو بدلنا ہو گا۔ اور تاریخ میں فاتحین و جرنیلوں کی بجائے ایسے دانشوروں اور دیگر مفکروں کو تلاش کرنا ہو گا کہ جن کے ہاں جبر و تشدد نہیں بلکہ ہم آہنگی و محبت ہے۔

مثلاً پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کی تاریخ کو اگر سیاسی طور پر لکھا جائے تو اس میں نفرت' جنگ' اور مخالفت کے سوائے اور کچھ نہیں' اور دو حکومتوں کے درمیان یہ دشمنی آہستہ آہستہ دونوں طرف کے عوام میں گئی جاتی ہے' لیکن اگر اس کی سماجی اور ثقافتی تاریخ پر زور دیا جائے تو ہمیں دونوں طرف کے عوام میں ہم آہنگی اور یکجہتی نظر آئے گی۔ سیاسی تاریخ میں جو سرحدیں ہیں۔ وہ سرحدیں ثقافت توڑ دیتی ہے اور مخالفت و دشمنی کے بجائے یہ ملنے اور بات چیت پر زور دیتی ہے اس لئے سیاسی تعصبات کو دور کرنے کے لئے ثقافتی تاریخ کی بڑی ضرورت ہے۔

سیاسی تاریخ کا دائرہ بڑا محدود ہوتا ہے اس میں ریاست اس کے ادارے' اور اس کی پالیسیاں آتی ہیں۔ جب کہ سماجی تاریخ میں معاشرہ اور لوگ باعمل نظر آتے ہیں اور اس لئے یہ سیاسی تاریخ کو پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔ اس وقت پاکستان کے معاشرہ کو سیاست سے زیادہ ثقافت کی ضرورت ہے۔

بنیادی تاریخ

جیسے جیسے دنیا میں تبدیلیاں آ رہی ہیں' ایسے ایسے زیادہ سے زیادہ لوگ اب سیاسی و سماجی اور معاشی امور میں حصہ لے رہے ہیں اور جمہوری روایات و اقدار مضبوط ہو رہی ہیں۔ اس کی وجہ سے تاریخ کا دائرہ کار بھی بڑھ رہا ہے اور اب اس کے موضوعاتِ صرف حکمران اور امراء نہیں رہے بلکہ عام لوگ اور ان کی روز مرہ کی زندگی ہو گئے ہیں۔

اس صورت حال میں جرمنی میں کچھ مورخوں نے کہ جن کا تعلق یونیورسٹیوں سے نہیں ہے۔ تاریخ کو ایک نئی شکل دی ہے اور ایسی تاریخ لکھنے کا سلسلہ شروع کیا ہے کہ جس کا تعلق لوگوں کی روز مرہ کی زندگی سے ہے'اور اس کے لئے انہوں نے زبانی تاریخ کے طریقہ کو استعمال کرنا شروع کیا ہے' مثلاً ہٹلر کے زمانہ کی تاریخ کو انہوں نے عام لوگوں کے نقطہ نظر سے لکھا ہے۔ کیونکہ اب تک ایسے بہت سے لوگ زندہ ہیں کہ جنہوں نے ہٹلر اور نازی دور کو دیکھا ہے اور اس میں انہوں نے کئی طریقوں سے حصہ بھی لیا ہے۔ اس لئے نئی تاریخ لکھنے والوں نے ان کے انٹرویو اور بات چیت کر کے۔ اور ان کی رائے معلوم کر کے تاریخ کے ایسے پہلوؤں سے پردہ اٹھایا ہے کہ جن کے بارے میں سرکاری یا پیشہ ور مورخ خاموش تھے۔

اس کے نتیجہ میں ایک ایسی تاریخ تشکیل ہوئی ہے کہ جو سرکاری اور اکیڈمک تاریخ سے بالکل جدا ہے۔ کیونکہ سرکاری تاریخ کی بنیاد سرکاری دستاویزات' فرامین' خطوط' اور آرکائیوز پر ہوتی ہے' اور اس لئے ان ماخذوں کی بنیاد پر جو تاریخ لکھی جائے گی لامحالہ طور پر اس میں سرکاری نقطہ نظر غلبہ حاصل کرلیتا ہے۔ اور اسی لئے واقعات کو حکومتی نقطہ نظر سے لکھا جاتا ہے۔ اس لئے یہ تاریخ واقعات کو اوپر سے دیکھتی ہے۔ اور ان واقعات کی تہہ میں جو عمل ہوتا ہے اسے نظرانداز کردیتی ہے۔

جب کہ اس کے مقابلہ میں بنیادی تاریخ کہ جس کا تعلق معاشرہ کی جڑوں سے ہوتا ہے یہ واقعات کی تشریح نچلی سطح سے کرتی ہے۔ اس کے ذریعہ مورخ ایک عام آدمی کے تجربات کو بیان کرتا ہے کہ جو سادہ انداز میں بات کرتا ہے اور عام انداز میں واقعات کو دیکھتا ہے۔ چونکہ ان کے بیانات میں حقیقت ہوتی ہے' یہ جو محسوس کرتے ہیں وہ بیان کرتے ہیں' اور انہیں اس کی کوئی خواہش نہیں ہوتی ہے کہ وہ مبالغہ آرائی کر کے خود کو تاریخ میں ہیرو ثابت کریں۔ اس لئے ان کے بیانات کی روشنی میں تاریخ کے عمل کو صحیح طور پر

سمجھا جا سکتا ہے۔ دوسرا اہم پہلو ان کے بیانات کا یہ ہوتا ہے کہ ان میں وسعت ہوتی ہے۔ اور یہ کسی خاص نقطہ نظر سے بات نہیں کرتے بلکہ زندگی کے تمام پہلوؤں کو اس میں سمو لیتے ہیں۔

اس تاریخ کی تشکیل کے بعد یہ ممکن ہو گیا ہے کہ فوری گزرے ہوئے زمانہ اور اس تاریخ کو بہتر طریقہ سے سمجھا جا سکے۔ کیونکہ عام لوگوں کی روز مرہ کی زندگی میں اشیاء کی قیمتیں' رہائش کے مسائل' ٹریفک' جرائم' غذا' کھیل' تفریح' خاندانی زندگی' تعلیم' صحت' زراعت' ٹیکسوں کا نظام' کلب کی زندگی' کتابیں پڑھنے کی عادت' اور ہمسائیوں کے ساتھ تعلقات' یہ اور دوسری چھوٹی چھوٹی چیزیں سب ہی آ جاتی ہیں۔

پاکستان میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اس قسم کی بنیادی تاریخ لکھی جائے تا کہ ہمارے معاشرہ میں جو تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ انہیں سمجھا جا سکے۔ ایوب خان' بھٹو اور ضیاء کے دور میں عام لوگوں کی روز مرہ کی زندگی انتہائی دلچسپ موضوع ہے تاکہ اس عرصہ میں ہونے والے واقعات کے نتائج اور ان کے اثرات کا تجزیہ کیا جا سکے۔ یہ معلوم کیا جائے کہ اخلاقی قدروں کا زوال کیسے ہوا؟ کیا اس کی وجہ سے معاشرہ سماجی طور پر آگے بڑھا ہے یا مزید پس ماندہ ہوا ہے؟ یہ اور اس قسم کے بہت سے سوالات ہیں کہ جن کا جواب لوگوں کے تجربات کی روشنی میں دیا جا سکتا ہے۔

اس لئے تاریخ سیاستدانوں' مصلحین' اور سماجی کارکنوں کے لئے ایک انتہائی اہم ہتھیار ہے کہ جس کے ذریعہ وہ معاشرہ اور لوگوں کے رجحانات' خواہشات' اور منصوبوں کو سمجھ سکتے ہیں اور معاشرہ میں جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں ان کے بارے میں واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ اور یہ کام بنیادی تاریخ پورا کر سکتی ہے کیونکہ اس تاریخ میں لوگوں کے دلی جذبات ہوتے ہیں ان کے دکھ ہوتے ہیں' ان کی محرومیاں ہوتی ہیں اور ان کے عزائم' ہمت' جرات' اور حوصلے بھی ہوتے ہیں کہ کس طرح ان عام لوگوں نے آمرانہ دور حکومت اور ان کی سختیوں کو برداشت کیا اور ان کے جبر اور تشدد کے باوجود خود کو برقرار رکھا۔ عوام میں زندہ رہنے کا حوصلہ باقی رہا جبکہ آمرانہ حکومتیں ختم ہو گئیں۔

اسلامی تاریخ

اسلامی تاریخ کی اصطلاح مغربی مستشرقین نے استعمال کرنا شروع کی' اسی لئے انہوں نے تاریخ کو تقسیم کرتے ہوئے اس کو اپنے نظریات' خیالات' سہولت یا نقطہ نظر سے مختلف ادوار دیکھ کر نام دیئے۔ مثلاً ابتدائی دور میں انہوں نے اس کے لئے محمڈن کا لفظ استعمال کیا۔ اور اس سے محمڈن تاریخ اور محمڈن پیوپل کی اصطلاح شروع کی۔ بعد میں کچھ مسلمان یورپی تعلیم یافتہ لوگوں نے اس پر اعتراض کرنا شروع کیا اور یہ دلیل دی کہ مسلمانوں کو محمڈن کہنا اس لئے صحیح نہیں کہ یہ لوگ عیسائیوں کی طرح پیغمبر کے ماننے والے نہیں ہیں بلکہ خدا اور اس کے مذہب کے پیرو کار ہیں لہٰذا ان کے لئے مسلمانوں کا لفظ استعمال کرنا چاہئے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ محمڈن کی اصطلاح ترک کر کے اب مسلم یا اسلامی تاریخ کو استعمال کیا جاتا ہے۔

اس میں بھی مشکلات پیش آئیں۔ کیونکہ جب اسلام کی بنیادی تعلیمات اور عملی طور پر تاریخ میں تضادات سامنے آئے۔ تو کچھ مسلمان دانشوروں نے اس بات کی تشریح کی کہ اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کی تاریخ میں فرق ہے۔ لہٰذا ان میں سے کچھ کے نزدیک اسلامی تاریخ خلفاء راشدین کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ اور کچھ صرف رسول اللہؐ کے دور کو اسلامی تاریخ تسلیم کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد کی تاریخ اگرچہ مسلمانوں کی تاریخ ہے مگر اس کا اسلام سے کوئی واسطہ اور تعلق نہیں ہے۔

لیکن یہ بات واضح ہے کہ اسلامی یا مسلمانوں کی تاریخ جدید اصطلاح ہے کہ جسے مغربی مستشرقین نے مقبول بنایا ہے۔ ورنہ قدیم مسلمان مورخوں نے اس کو کبھی بھی استعمال نہیں کیا۔

اس کے بعد اسلامی یا مسلمانوں کی تاریخ کا دوسرا مرحلہ آتا ہے کہ اس سے کس طرح سے مختلف ادوار میں تقسیم کیا جائے۔ مستشرقین کے نقطہ نظر سے اس کا پہلا دور اسلام کی آمد سے شروع ہو کر عباسی خلافت کے خاتمہ تک جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر علاقائی حکمراں خاندانوں کی تاریخ شروع ہو جاتی ہے۔ مصر اور شرقی افریقہ کی تاریخ کو تاریخ مغرب کہا جاتا ہے۔ اس میں فاطمین مصر' الموحدین اور دوسرے خاندان آتے ہیں۔ اسپین میں مسلمانوں کی حکومت کو "مورش دور حکومت" کہا جاتا ہے اس کے بعد عثمانی ترکوں' ایران کے صفویوں' ہندوستان کے مغلوں کی تاریخ آ جاتی ہے۔ اور اسلامی تاریخ کی اصطلاح اس

طرح سے اب صرف عربوں اور مشرق وسطیٰ کی تاریخ کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔

جب عرب ملکوں میں یورپی نوآبادیاتی نظام قائم ہوا تو سیاسی طور پر عربوں میں قوم پرستی کی تحریک شروع ہوئی تاکہ خود کو آزاد کرایا جائے، اور قوم پرستی کی بنیاد پر خود کی شناخت کرائی جائے۔ اسی ضمن میں انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ تاریخ کو مذہب سے آزاد کر کے سیکولر بنایا جائے۔ اس کے نتیجہ میں عیسائی اور دوسرے مذاہب کے عرب ایک قوم ہوئے اور وہ مسلمان جو عرب نہیں تھے وہ ہم مذہب بن گئے۔ چنانچہ عرب قوم پرستی نے اسلامی تاریخ کو عربی بنا دیا۔ اس میں خصوصیت سے عیسائی عربوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس سلسلہ کی مشہور کتاب فلپ حتی کی تاریخ عرب ہے۔

عرب قوم پرستی کے زیر اثر جو تاریخیں لکھی گئیں۔ ان میں مختلف نقطہ ہائے نظر ملتے ہیں۔ مثلاً اکثر مورخوں نے اسلام سے پہلے کے دور کو جاہلیہ تسلیم نہیں کیا اور اس کی شان و شوکت کو ابھارا، کچھ عرب ملکوں نے جن میں عراق قابل ذکر ہے۔ اس نے قدیم میسوپوٹامیہ کی تہذیب کو خوب اجاگر کیا اور اس کے ذریعہ عراق کی عظمت کو ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ مصر میں ایک گروہ وہ ہے جو فرعونوں کی تاریخ پر فخر کرتا ہے۔ تو دوسرا وہ بھی ہے کہ جو اس ماضی کو جو اسلام سے پہلے تھا اسے برا بھلا کہتا ہے۔ اور مکمل طور پر اسے رد کرتا ہے۔

لیکن اکثر مسلمان ملکوں میں تاریخ کو مذہب کے زیر اثر لکھا گیا۔ اور ایسے مورخ کم رہے ہیں جنہوں نے تاریخ کو سیکولر نقطہ نظر سے لکھا ہو۔ اس نے اس تاریخ نویسی کی ایک اہم کمزوری یہ ہے کہ اس میں خود پر تنقیدی عنصر نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور اس کی وجہ سے تاریخ محض تفریح کا ذریعہ رہ جاتی ہے۔ اس کے ذریعہ کسی قسم کا شعور پیدا نہیں ہوتا ہے۔ مثلاً مصر کے مشہور ادیب و مورخ طہٰ حسین نے جب ایام جاہلیہ کے شعراء پر کتاب لکھی تو اس پر عرب دنیا میں زبردست احتجاج ہو گیا اور بالآخر مجبور ہو کر مصنف نے دوسرے ایڈیشن میں اس کے کافی حصوں کو نکال دیا۔

اس خطرہ کے پیش نظر مورخوں کے لئے یہ ممکن نہیں رہا ہے کہ وہ تاریخ پر تنقید کر سکیں اور تحقیق کا کوئی اعلیٰ معیار قائم کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب مسلمانوں کی تاریخ پر جتنا اعلیٰ اور پایہ کا کام ہو رہا ہے وہ مغربی محققین کر رہے ہیں اور ہم ان کے نظریات سے متاثر ہو رہے ہیں۔

اگرچہ چند محدود مسلمان مورخین نے کہ جنہوں نے یورپی تعلیم حاصل کی اور یورپ

کے تحقیقی طریقہ کار سے واقفیت حاصل کی۔ انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ مغربی تاریخ کے نقطہ نظر سے خود کو آزاد کرائیں۔ اور اس کی جگہ خود اپنا تاریخی نقطہ نظر دیں، اور ان اعتراضات کا بھی جواب دیں کہ جو مغربی مورخین نے مسلمانوں کی تاریخ پر کئے ہیں۔ اس لئے انہوں نے جو اپنے دفاع میں تاریخ کا نقطہ نظر اختیار کیا۔ اس میں کوشش کی گئی کہ اپنے ماضی کو شاندار بنا کر پیش کریں۔ اور اپنی برائیوں پر تنقید کرنے کے بجائے انہیں چھپا دیں یا ان کا دفاع کریں اور مغربی مستشرقین کو متعصب، تنگ نظر اور مسلمانوں کے دشمن کے طور پر پیش کریں کہ جو جان بوجھ کر تاریخ کو مسخ کر رہے ہیں۔ تاکہ اس طرح سے ان کی بات کو تسلیم کر لیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے جو تاریخ کا نقطہ نظر اختیار کیا اس میں انہوں نے مسلمانوں کی تہذیبی و تمدنی ورثہ کو اجاگر کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کی تہذیب یورپ کے مقابلے میں اعلیٰ و ارفع تھی۔ چنانچہ جب اسلامی تہذیب و تمدن اپنے عروج پر تھے۔ اس وقت یورپ جہالت کے اندھیروں میں تھا، اور مسلمانوں نے اہل یورپ کو تہذیب و تمدن کے ابتدائی اسباق پڑھائے۔ اور انہیں اعلیٰ ثقافت سے روشناس کرایا۔

چنانچہ ان کی دلیل یہ تھی کہ اہل یورپ کی جغرافیائی دریافتیں صرف اسی صورت میں کامیاب ہوئیں کہ ان کی راہنمائی مسلمان جہاز رانوں نے کی۔ کولمبس اور واسکوڈے گاما دونوں کی کامیابی میں عرب جہاز رانوں کا ہاتھ ہے ورنہ وہ خود سے یہ راستے دریافت نہیں کر سکتے تھے۔

اس طرح جب یورپ میں تعلیم مفقود تھی۔ اس وقت قرطبہ اور اسپین علم وادب کے مرکز تھے، اور یہیں سے اہل یورپ نے علم حاصل کیا اور مسلمانوں سے بہت کچھ سیکھا۔

مسلمان حکومتوں اور معاشروں کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ یہ اقلیتوں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے لئے رواداری کے جذبات رکھتے تھے۔ اس لئے ان کے دور میں یہودی اور عیسائی آزادی کے ساتھ رہے اور انہیں ہر قسم کے حقوق حاصل رہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ بہت سے مسلمان حکمرانوں کے مشیر اور مصاحب یہودی تھے۔ اس لئے یہودیوں کے خلاف نفرت یورپ کی پیداوار ہے۔ مسلمانوں کی نہیں۔

کیونکہ بہت سے مسلمان ممالک یورپ کی نوآبادی کے طور پر ان کے محکوم رہے۔ اس لئے وہ اس کو اہل یورپ کی اس دشمنی سے تعبیر کرتے ہیں کہ جو صلیبی جنگوں کی صورت میں پیدا ہوئی تھی۔ ناکامی کا یہ صدمہ ہے جو انہیں بار بار مسلمانوں سے انتقام کے

طرح سے اب صرف عربوں اور مشرق وسطیٰ کی تاریخ کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔

جب عرب ملکوں میں یورپی نوآبادیاتی نظام قائم ہوا تو سیاسی طور پر عربوں میں قوم پرستی کی تحریک شروع ہوئی تاکہ خود کو آزاد کرایا جائے' اور قوم پرستی کی بنیاد پر خود کی شناخت کرائی جائے۔ اسی ضمن میں انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ تاریخ کو مذہب سے آزاد کر کے سیکولر بنایا جائے۔ اس کے نتیجہ میں عیسائی اور دوسرے مذاہب کے عرب ایک قوم ہوئے اور وہ مسلمان جو عرب نہیں تھے وہ ہم مذہب بن گئے۔ چنانچہ عرب قوم پرستی نے اسلامی تاریخ کو عربی بنا دیا۔ اس میں خصوصیت سے عیسائی عربوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس سلسلہ کی مشہور کیاب فلپ حتی کی تاریخ عرب ہے۔

عرب قوم پرستی کے زیر اثر جو تاریخیں لکھی گئیں۔ ان میں مختلف نقطہ ہائے نظر ملتے ہیں۔ مثلاً اکثر مورخوں نے اسلام سے پہلے کے دور کو جاہلیہ تسلیم نہیں کیا اور اس کی شان و شوکت کو ابھارا۔ کچھ عرب ملکوں نے جن میں عراق قابل ذکر ہے۔ اس نے قدیم میسوپوٹامیہ کی تہذیب کو خوب اجاگر کیا اور اس کے ذریعہ عراق کی عظمت کو ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ مصر میں ایک گروہ وہ ہے جو فرعونوں کی تاریخ پر فخر کرتا ہے۔ تو دوسرا وہ بھی ہے کہ جو اس ماضی کو جو اسلام سے پہلے تھا اسے برا بھلا کہتا ہے۔ اور مکمل طور پر اسے رد کرتا ہے۔

لیکن اکثر مسلمان ملکوں میں تاریخ کو مذہب کے زیر اثر لکھا گیا۔ اور ایسے مورخ کم رہے ہیں جنہوں نے تاریخ کو سیکولر نقطہ نظر سے لکھا ہو۔ اس نے اس تاریخ نویسی کی ایک اہم کمزوری یہ ہے کہ اس میں خود پر تنقیدی عنصر نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور اس کی وجہ سے تاریخ محض تفریح کا ذریعہ رہ جاتی ہے۔ اس کے ذریعہ کسی قسم کا شعور پیدا نہیں ہوتا ہے۔ مثلاً مصر کے مشہور ادیب و مورخ طہ حسین نے جب ایام جاہلیہ کے شعراء پر کتاب لکھی تو اس پر عرب دنیا میں زبردست احتجاج ہو گیا اور بالآخر مجبور ہو کر مصنف نے دوسرے ایڈیشن میں اس کے کافی حصوں کو نکال دیا۔

اس خطرہ کے پیش نظر مورخوں کے لئے یہ ممکن نہیں رہا ہے کہ وہ تاریخ پر تنقید کر سکیں اور تحقیق کا کوئی اعلیٰ معیار قائم کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب مسلمانوں کی تاریخ پر جتنا اعلیٰ اور پایہ کا کام ہو رہا ہے وہ مغربی محققین کر رہے ہیں اور ہم ان کے نظریات سے متاثر ہو رہے ہیں۔

اگرچہ چند محدود مسلمان مورخین نے کہ جنہوں نے یورپی تعلیم حاصل کی اور یورپ

کے تحقیقی طریقہ کار سے واقفیت حاصل کی۔ انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ مغربی تاریخ کے نقطہ نظر سے خود کو آزاد کرائیں۔ اور اس کی جگہ خود اپنا تاریخی نقطہ نظر دیں' اور ان اعتراضات کا بھی جواب دیں کہ جو مغربی مورخین نے مسلمانوں کی تاریخ پر کئے ہیں۔ اس لئے انہوں نے جو اپنے دفاع میں تاریخ کا نقطہ نظر اختیار کیا۔ اس میں کوشش کی گئی کہ اپنے ماضی کو شاندار بنا کر پیش کریں۔ اور اپنی برائیوں پر تنقید کرنے کے بجائے انہیں چھپا دیں یا ان کا دفاع کریں اور مغربی مستشرقین کو متعصب' تنگ نظر اور مسلمانوں کے دشمن کے طور پر پیش کریں کہ جو جان بوجھ کر تاریخ کو مسخ کر رہے ہیں۔ تاکہ اس طرح سے ان کی بات کو تسلیم کر لیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے جو تاریخ کا نقطہ نظر اختیار کیا اس میں انہوں نے مسلمانوں کی تہذیبی و تمدنی ورثہ کو اجاگر کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کی تہذیب یورپ کے مقابلے میں اعلیٰ و ارفع تھی۔ چنانچہ جب اسلامی تہذیب و تمدن اپنے عروج پر تھے۔ اس وقت یورپ جہالت کے اندھیروں میں تھا' اور مسلمانوں نے اہل یورپ کو تہذیب و تمدن کے ابتدائی اسباق پڑھائے۔ اور انہیں اعلیٰ ثقافت سے روشناس کرایا۔

چنانچہ ان کی دلیل یہ تھی کہ اہل یورپ کی جغرافیائی دریافتیں صرف اسی صورت میں کامیاب ہوئیں کہ ان کی راہنمائی مسلمان جہاز رانوں نے کی۔ کولمبس اور واسکوڈے گاما دونوں کی کامیابی میں عرب جہاز رانوں کا ہاتھ ہے ورنہ وہ خود سے یہ راستے دریافت نہیں کر سکتے تھے۔

اس طرح جب یورپ میں تعلیم مفقود تھی۔ اس وقت قرطبہ اور اسپین علم وادب کے مرکز تھے' اور یہیں سے اہل یورپ نے علم حاصل کیا اور مسلمانوں سے بہت کچھ سیکھا۔

مسلمان حکومتوں اور معاشروں کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ یہ اقلیتوں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے لئے رواداری کے جذبات رکھتے تھے۔ اس لئے ان کے دور میں یہودی اور عیسائی آزادی کے ساتھ رہے اور انہیں ہر قسم کے حقوق حاصل رہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ بہت سے مسلمان حکمرانوں کے مشیر اور مصاحب یہودی تھے۔ اس لئے یہودیوں کے خلاف نفرت یورپ کی پیداوار ہے۔ مسلمانوں کی نہیں۔

کیونکہ بہت سے مسلمان ممالک یورپ کی نوآبادی کے طور پر ان کے محکوم رہے۔ اس لئے وہ اس کو اہل یورپ کی اس دشمنی سے تعبیر کرتے ہیں کہ جو صلیبی جنگوں کی صورت میں پیدا ہوئی تھی۔ ناکامی کا یہ صدمہ ہے جو انہیں بار بار مسلمانوں سے انتقام کے

لئے ابھارتا ہے۔ اور مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کا قیام بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ جیسا کہ صلیبی جنگوں کے دوران شام میں عیسائیوں نے اپنی حکومتیں قائم کر لیں تھیں۔ اس لئے یہ یہودیوں اور عیسائیوں کی ناشکر گزاری ہے کہ انہوں نے ماضی کی رواداریوں کے نتیجہ میں، مسلمانوں کے ساتھ برا سلوک کیا۔

بعد میں کچھ ایسے مفروضے بنائے گئے کہ جنہوں نے مسلمان مورخین کی اس دلیل کو وزنی بنا دیا کہ انہوں نے یورپ کی تہذیبی کی ترقی میں حصہ لیا ہے۔ مثلاً انیسویں صدی میں اسپین کی شان و عظمت کے بارے میں دریافت ہوئی، ہوا یہ کہ ۱۸۳۰ء اور ۱۸۸۶ء کے درمیان سترھویں صدی کے ایک مورخ المقری کی کتاب انگلستان میں چھپی۔ اس میں مسلمان اسپین کے سائنس و علم ادب کے بارے میں واقعات تھے۔ اس کتاب کی اشاعت اور مسلمانوں کے کارناموں نے مسلمان دنیا کے لئے فخر کا سبب فراہم کیا۔ اور ترکی کے سلطان عبدالحمید دوم نے فوراً ترکی کے اسکالرز کو اسپین بھیجا کہ وہ وہاں سے مسلمانوں کے دور کے مسودات دریافت کر کے لائیں۔ تاکہ اسپین کی عظمت جو مسلمان کے دور میں تھی۔ اس کو مزید ثابت کیا جائے۔ اس کے بعد سے مسلمان مورخوں کے لئے یہ ایک پسندیدہ موضوع بن گیا ہے کہ جس کے ذریعہ سے وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے اہل یورپ کو علم و ادب اور سائنس سے روشناس کرایا اور جدید علم انہوں نے مسلمانوں سے سیکھے کہ جن کی کتابیں اس وقت یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔

اس ضمن میں گبن کا یہ نقطہ نظر کہ اگر مسلمانوں کو جنوبی فرانس میں شکست نہیں ہو جاتی تو اس وقت یورپ میں اسلام کی حکمرانی ہوتی۔ اس پر بہت سے مسلمان مورخ افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اس کی ساری ذمہ داری چند جرنیلوں پر ڈال دیتے ہیں کہ جن کی خود غرضانہ پالیسی کی وجہ سے یہ سنہری موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

اس قسم کی تاریخ اور نقطہ نظر رد عمل کی پیداوار ہوتے ہیں اس لئے ان میں یہ مواد نہیں ہوتا ہے کہ وہ صحیح تاریخی شعور پیدا کریں۔ یہ محض جذباتی طور پر فخر اور بڑائی کو پیدا کرتے ہیں۔ مگر اس کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ہوتی ہے اور نہ اس بنیاد پر حال کی تعمیر ہو سکتی ہے۔

جو ماضی تشکیل کرے گا، وہ مستقبل پر حکومت کرے گا

ماضی کی تشکیل کس طرح سے ہو، کن بنیادوں پر ہو اور کس لئے ہو؟ یہ وہ اہم سوالات ہیں کہ جنہیں تاریخ پڑھتے ہوئے دیکھنا چاہئے۔ کیونکہ ماضی کی تشکیل ذہنوں کو بنانے، تبدیل کرنے، انہیں ایک خاص متعین راستہ دکھانے میں مدد دیتی ہے۔ مثلاً ہمارا ماضی ابتداء ہی سے رجعت پسند مورخوں کے ہاتھوں تشکیل ہوا، اور انہوں نے فرسودہ روایات اور اداروں کی تعریف کی اور حکمراں طبقوں کے مفادات کا تحفظ کیا۔ اس لئے ہماری نوجوان نسل ماضی کے دوسرے پہلوؤں سے ناواقف ہے، اور وہ جھوٹ، فریب، تنگ نظری کے سایہ میں پروان چڑھی ہے، اور یہی چیزیں اس کے ذہن میں سما گئی ہیں۔

ماضی کا علم انتہائی اہم ہے کیونکہ اس کے اندر معاشرہ کی سماجی اور ثقافتی جڑیں ہوتی ہیں۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ اگر ماضی کے بارے میں ہماری معلومات ادھوری ہوں گی تو ہم اپنے حال کو نہیں سمجھ پائیں گے اور نہ مستقبل کی بہتر طور پر تعمیر کر سکیں گے۔ اس لئے یہ سوال اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ ماضی کی تشریح کس طرح کی جائے کیا اس سے لوگوں کو جاہل رکھا جائے۔ یا اس کے ذریعہ ان میں شعور پیدا کیا جائے۔

اس لئے ایک پہلو تو یہ ہے بادشاہوں اور امراء کی تعریف کی جائے اور ان کی فیاضی و بہادری کے واقعات بیان کئے جائیں۔ کیونکہ اس کے ذریعہ لوگوں کو ذہنی طور پر اس پر تیار کیا جائے گا کہ وہ اقتدار کے حامل لوگوں کی عزت کریں اور ان کے وفادار رہیں اس کے بعد علماء کے کردار کی تعریف کی جاتی ہے کہ کس طرح جذبہ حق سے سرشار ہو کر انہوں نے جابر سلطان کے سامنے بھی کلمہ حق کہا۔ ان کی اس تاریخی تصویر کے سامنے آنے کے بعد علماء کی رہنمائی معاشرہ میں مستحکم ہو جاتی ہے۔ اور لوگوں میں یہ تاثر عام ہو جاتا ہے کہ انہوں نے ماضی میں بھی حق کا ساتھ دیا تھا اور اب بھی یہ حق کے لئے لڑیں گے۔ اس کے بعد صوفیوں کا نمبر آتا ہے۔ اور اکثر تو حکمرانوں سے بھی برتر قرار دیدیا جاتا ہے۔ یہ اس لئے ضروری ہے تاکہ صوفیا کی تعلیمات لوگوں میں بغاوت کے جذبات کو نہیں ابھرنے دیں اور انہیں قناعت و صبر کا درس دے کر مطمئن رکھیں۔

یہ ہمارا ماضی ہے کہ جو ہمارے مورخوں نے تشکیل دیا ہے۔ اور اس کو اس قدر مقدس بنا دیا ہے کہ اس سے ذرا بھی انحراف کفر کے برابر سمجھا جاتا ہے

اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ماضی کی از سرنو تشکیل کی جائے اور حکمرانوں علماء اور صوفیاء کے کردار کو سامنے لایا جائے کہ جس نے معاشرہ کو آگے نہیں بڑھنے دیا اور ایک جگہ جامد رکھا۔

سیاسی تاریخ کا لکھنا

سیاسی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ اس کو حکمراں طبقے اپنے اقتدار اور طاقت کے لئے استعمال کرتے ہیں' اور اس کے ذریعہ وہ ایک طرف تو اپنے بارے میں خوش کن اور اچھی تصویر پیش کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنے مخالفوں کے بارے میں من گھڑت قصے کہانیوں کے ذریعہ ان کے لئے لوگوں میں نفرت پیدا کرتے ہیں۔ اور جب کبھی وہ بحرانوں میں گرفتار ہوں' یا پریشانیوں میں مبتلا ہوں تو اس وقت وہ ماضی کا سہارا لے کر خود کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں' کیونکہ ماضی کی شان و شوکت کی باتیں لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرتی ہیں' اور حب الوطنی و قوم پرستی کے نام پر انہیں مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ معاشرے کی ناانصافیوں کو برداشت کریں' اور ان کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائیں۔

کیونکہ ماضی کی شان و شوکت کو استعمال کر کے ایک طرف تو قوم پرستی کے جذبات کو گہرا کیا جاتا ہے تو دوسری طرف اس کے ذریعہ سختیوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کیا جاتا ہے مثلاً پرتگال میں سالازار کی آمریت کے دوران میں اس کے خلاف تمام مخالفتوں کو اس بنیاد پر دبا دیا گیا کہ وہ پرتگال کی ماضی کی روایات کو برقرار رکھے ہوئے ہے' اور ایسی کوئی بھی مخالفت جو ماضی کو روایات اور عظمت کو ختم کرنے کی کوشش کرے وہ ملک اور قوم کے خلاف ایک سازش ہے۔ یہی صورت حال بہت سے ایشیا و افریقہ کے نئے آزاد ہونیوالے ملکوں کی ہے جو ماضی کے ذریعہ اپنی آمرانہ اور جابرانہ حکومتوں کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

ماضی قوموں کو اس وجہ سے دلکش لگتا ہے کیونکہ اس میں جو فتوحات اور بہادری کے واقعات ہوتے ہیں' اس سے احساس محرومی کے مارے لوگ نیا جذبہ اور جوش محسوس کرتے ہیں اور خواہش کرتے ہیں کہ ان کا یہ ماضی دوبارہ سے واپس آ جائے۔ چنانچہ یہی صورت حال پاکستان میں ہے کہ ہمارے حکمراں مسائل کو حل کرنے کے بجائے لوگوں کا حوصلہ یہ کہہ کر بڑھاتے ہیں کہ ان کے آبا و اجداد نے صدیوں ہندوستان پر حکومت کی' اور اب ان میں پھر سے یہ حوصلہ' جرات اور بہادری ہونا چاہئے کہ وہ لال قلعہ پر جھنڈا لہرا دیں' اور ہوتا یہ ہے کہ لوگ جذبات میں آ کر توازن کھو بیٹھتے ہیں اور حقائق کو سمجھنے سے معذور ہو جاتے ہیں اور جب وہ اس صورت حال میں ہوں تو یہ آسان ہو جاتا ہے کہ انہیں نعروں کے ذریعہ غلط راستوں پر لے جایا جائے اور انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔

اس لئے سیاسی تاریخ حکمرانوں کے ہاتھوں میں ایک خطرناک ہتھیار رہی ہے جو اس کے ذریعہ اپنے اقتدار کو مضبوط کرتے ہیں' اور لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرتے ہیں' اور سیاسی تاریخ کو محض اپنے کارناموں اور واقعات کے لئے استعمال کرتے ہیں' چنانچہ اس قسم کی تاریخوں میں حکمراں طبقوں کے افراد نیک خصلت اور فرشتہ سیرت ہوتے ہیں کہ جو ہمیشہ لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرتے ہیں۔

پاکستان میں اس کا فائدہ ہمارے فوجی حکمرانوں نے پوری طرح سے اٹھایا' اور لوگوں کو یہ تاثر دیا کہ صرف طاقت ور افراد ہی ان کی حفاظت کر سکتے ہیں' اور ان کے مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔ اس لئے فوج پاکستان کے اندرون و بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ اس تاثر کی وجہ سے فوج شان و شوکت کی علامت بن گئی اور اس کے خلاف بولنا ملک و قوم کے خلاف غداروں کے مترادف ٹھہرا۔

سیاسی تاریخ کے اس منفی استعمال کی وجہ سے اس کی حیثیت بری طرح سے متاثر ہوئی اور مورخوں نے اس کو نظرانداز کرتے ہوئے ثقافتی و معاشی تاریخ کی طرف توجہ دینا شروع کی تاکہ تاریخ کو چند افراد کے لئے نہیں بلکہ معاشرے اور لوگوں کے لئے استعمال کیا جا سکے۔ اسی وجہ سے سیاسی تاریخ لکھنے والوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ اس کو نئے سرے سے وسیع خطوط پر استوار کیا جائے اور اس کی کمزوریوں کو دور کر کے اس کو اس قابل بنایا جائے کہ اس میں حکمرانوں اور افراد کے بجائے معاشرے کی تاریخ ہو' اور یہ محض بادشاہوں اور جنگ و جدل کا مرقع بن کر نہیں رہ جائے بلکہ سیاست کے زیراثر جو معاشی و ثقافتی تبدیلیاں آتی ہیں انہیں بھی لکھا جائے۔ چنانچہ ان نظریات کے زیراثر اب سیاسی تاریخ کی تشکیل نو ہو رہی ہے اور اس کو آمروں اور حکمرانوں کے استعمال کے بجائے لوگوں میں شعور پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔

قبائلی تاریخ

اس کی ایک مثال قبائلی تاریخ کا لکھنا ہے۔ اول تو مورخوں کے لئے جو سرحد اور بلوچستان کے قبائل کی تاریخ لکھنا چاہتے ہیں' ان کے لئے سب سے بڑی یہ مشکل ہے کہ چونکہ ان علاقوں میں ریاست اور اس کے ادارے کبھی مضبوط نہیں رہے اس لئے ان کی کوئی تاریخ جو کہ بسوط اور جامع ہو' وہ نہیں ہے۔ اور دوسرا یہ کہ چونکہ ان علاقوں کے قبائل ہمیشہ سے مرکزی حکومت کے خلاف لڑتے رہے ہیں۔ اس لئے دربار کے مورخ ان قبائل کو باغی اور سرکش کہتے رہے ہیں اور ان علاقوں کو انتشار و بے چینی کا مرکز بتایا ہے۔ تاریخ میں ان کے لئے جو منفی رویہ ہے اس کی وجہ سے ان قبائل کا کردار مثبت طور پر نہیں ابھرا' اور ان کے لئے کوئی ہمدردی کے جذبات پیدا نہیں ہوئے۔ سرکاری مورخ ان قبائل کی روایات' رسموں' عادات' اور طور طریق سے بے خبر رہے' یا ان پر زیادہ توجہ نہیں دی' اور انہیں ریاست کے امن و استحکام کے لئے ہمیشہ ایک خطرہ جانا۔

جب ہندوستان میں برطانوی اقتدار قائم ہوا تو انہوں نے بھی اسی نقطہ نظر کو ورثہ میں پایا' اور ان قبائل کو باغی و سرکش گردانا۔ کیونکہ ایک طرف تو برطانوی اقتدار کی ان قبائل کے ساتھ مسلسل جنگ رہی' جس کی وجہ سے ان کا رویہ مخالفانہ رہا' مگر دوسری طرف یہ بھی ہوا کہ کچھ لوگوں نے ان کی بہادری و جرات کی تعریف کی' اور یہی وجہ تھی کہ ان لوگوں نے یہ کوشش کی کہ ان قبائل کے بارے میں رویہ اپنانے سے پہلے یا کوئی پالیسی تشکیل دینے سے پہلے ان کی تاریخ' ثقافت' رسوم و رواج کا مطالعہ کیا جائے' ان کی زبانوں کو سیکھا جائے' اور اس کے بعد ان سے بات چیت کی جائے' یا جنگ کی جائے' یا ان سے معاہدے کئے جائیں۔

چنانچہ یورپی سیاحوں' مورخوں ماہر نسلیات' لسانیات اور عمرانیات' نے ان قبائل کے بارے میں تحقیقات کا آغاز کیا' وہ ان لوگوں میں جا کر رہے' ان کی زبانیں سیکھیں اور ان کے بارے میں تحریری و زبانی مواد جمع کیا' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی بہت سی زبانیں سامنے آئیں کہ جن سے دنیا والے بے خبر تھے' انہوں نے صرف ان زبانوں کو سیکھا ہی نہیں بلکہ انہیں کسی رسم الخط کے ذریعہ تحریر کرنا بھی شروع کیا۔ انہوں نے ان کی لوک کہانیاں' اور گیتوں کو جمع کیا' ان کی تاریخ سے مفروضوں کو نکال کر حقائق کو سامنے لائے' چنانچہ ان معلومات کے نتیجہ میں وہ قبائل کہ جو سرکش و باغی' جنگجو اور جاہل تھے' ان کی ایک نئی

تصویر دنیا کے سامنے آئی۔ ان کی تاریخ اور ثقافت نے دنیا کے تہذیبی ورثہ میں اضافہ کیا۔

چنانچہ ان دریافتوں کی وجہ سے تاریخ میں ان کو باعزت مقام ملا اور اب ان کی قبائلی روایات، و رسم رواج کو حقارت کے بجائے عزت سے دیکھا جانے لگا۔ مرکز سے ان کی مزاحمت کو محض بغاوت و سرکشی نہیں بلکہ آزادی کی جنگ کہا جانے لگا۔ ان کی بہادری، جرات اور سخاوت و فیاضی کی تعریفیں ہونے لگیں۔

اہل برطانیہ ان قبائل کے بارے میں اہم معلومات گزیٹیرز، دستاویزات، رپورٹس، خطوط، یادداشتوں، ڈائریوں، اور سفر ناموں کی شکل میں چھوڑ گئے ہیں اور اس لئے اب مورخوں کے لئے یہ سہولت ہے کہ وہ ان قبائل کی جامع تاریخ لکھ سکیں۔

لیکن محض یورپی تحقیق پر بھروسہ کرنا، اور اسی کی بنیاد پر تاریخ لکھنا تاریخ کے نظریات کو متاثر کرتا ہے، کیونکہ اس کے پس منظر میں نوآبادیاتی نظام حکومت اور اس کی پالیسی تھی، اس لئے پاکستان کے مورخوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس مواد سے ان تعصبات کی نشان دہی کریں کہ جو اس میں چھپا ہوا ہے، اور ساتھ ہی میں اپنی تحقیق کے ذریعہ تاریخ کو نئے سرے سے لکھیں کیونکہ اسی صورت میں ہم تاریخ کے ذریعہ لوگوں میں مثبت شعور پیدا کر سکیں گے۔

ہیروورشپ

متھ کی تشکیل

بہت سی ایسی مذہبی علامات جو آج مقدس ہیں، وہ اپنے ابتدائی دنوں میں نہ تو مقدس تھیں اور نہ ان کے ساتھ کسی قسم کی روحانی وابستگی تھی، ان کا تقدس آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ اور معاشرہ کی ضرورت کے ساتھ قائم ہوا یہاں تک کہ لوگ یہ بھول گئے کہ ابتداء میں یہ علامات کیا تھیں اور ان کا معاشرہ میں کیا مقام تھا۔

مثلاً صلیب کا نشان عیسائیت کی ابتداء میں کسی خاص مذہبی اہمیت کا حامل نہیں تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس ابتدائی زمانہ میں جب مبلغین عیسائیت کی تبلیغ کرتے تھے تو ان کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ کسی ایسی علامات سے پرہیز کریں کہ جو مایوسی اور ناامیدی کو پیدا کریں۔ تاکہ نئے عیسائیوں میں کسی قسم کا مجبوروں کا احساس نہ ہو۔ جب عیسائیت پوری طرح سے قائم ہو گئی اور اسے ریاست کی سرپرستی مل گئی۔ تو اس وقت صلیب بحیثیت ایک مذہبی علامت کے اہم ہو گئی اور دسویں صدی میں یہ چرچ کی تمام عمارتوں پر نظر آنے لگی بعد میں چرچ کے افسروں اور مذہبی علماء نے اس علامت کو لوگوں میں عقیدے کا استحکام اور قربانی کے جذبے کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ تاریخ کا یہ غیر اہم نشان آج عیسائیت کی اہم مذہبی علامت ہے۔

اسی طرح سے کنواری مریم کا تصور گیارھویں صدی کی پیداوار ہے۔ یہ اس ابتدائی زمانہ میں پیدا نہیں ہوا جب لوگوں کی زندگی سیدھی سادھی تھی، معاشرے اس میں کنواری مریم ان کے لئے باعث کشش نہیں ہو سکتی تھی۔ بعد میں عیسائی معاشرہ میں سماجی تبدیلیاں آئیں اور اس میں عورت کا سماجی مرتبہ پہلے کے مقابلہ میں بلند ہو گیا۔ آرٹ کے ایک مورخ کینتھ کلارک نے اس موضوع پر لکھتے ہوئے کہا کہ شاید یہ تصور اس وقت زیادہ ابھرا جب کہ صلیبی جنگوں سے عیسائی مجاہدین واپس آئے اور اپنے ساتھ عورتوں کی نیکیوں اور خوبیوں کا ایک تصور لائے کہ جس میں عورت مہربان اور رحمدلی کی علامت تھی۔ اب یہ علامت عیسائیت کی ایک اہم نشانی ہے کہ جو پوری دنیا کے عیسائیوں میں نازک جذبات و محبت کو پیدا کرتی ہے۔

یہ علامات کسی طرح سے اہم بن جاتی ہیں اور کس طرح سے متھ تشکیل پاتی ہیں اس کی ایک مثال ہندوستان میں مشہور صوفی خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ہے۔ جب یہ ہندوستان

آئے اور انہوں نے اجمیر میں رہائش اختیار کی تو انہوں نے ایک چھوٹی سے جماعت کو متاثر کیا جو ان کی مرید ہو گئی۔ جب ان کی وفات ہوئی تو یہ ہندوستان میں مشہور نہیں تھے اور اسی لئے ان کی قبر کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ پورے عہد سلاطین میں خواجہ گمنام رہے۔ کہا جاتا ہے کہ اکبر نے ایک مرتبہ دوران سفر کچھ لوگوں کو گاتے ہوئے سنا وہ ان کے گانے سے بڑا متاثر ہوا۔ اور اس نے ان درویشوں سے ان کے پیر کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ یہ زمانہ اکبر کی نوجوانی کا تھا۔ اور اس میں تجسس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور وہ روحانیت اور حق کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے خواجہ کے مقبرے کی زیارت کا فیصلہ کیا۔

اکبر نے مزار پر جا کر نہ صرف یہ کہ فاتحہ پڑھی بلکہ یہ حکم دیا کہ ان کی قبر پر مقبرہ تعمیر کرایا جائے اور دوسری عمارتیں بھی بنائی جائیں تاکہ زائرین کو سہولت ہو۔ اس زمانہ میں وہ خواجہ سے اس قدر متاثر ہوا کہ ہر سال ان کے مقبرے کی زیارت کو جانے لگا اور کچھ سفر تو اس نے پیادہ پا کئے۔

شاہی سرپرستی نے بہت جلد خواجہ کو مشہور کر دیا اور اس کی وجہ سے جلد ہی ان کے مریدوں کی تعداد بڑھ گئی۔ بادشاہ کی خوشنودی کی خاطر امراء اور درباریوں نے مزار کے لئے قیمتی تحفے تحائف دینا شروع کر دیئے۔ اس نے خواجہ کے مزار کی اہمیت کو اور بڑھا دیا اور پورے ہندوستان سے زائرین اجمیر میں زیارت کی غرض سے آنے لگے۔ اکبر کے بعد اس کے جانشینوں نے مزار اور اس کے ارد گرد اور عمارتیں تعمیر کرائیں اور اس کے اخراجات کے لئے زمینیں وقف کر دیں۔ اور جب خواجہ مغل شاہی خاندان کے سرپرست ولی بن گئے تو ان کا مزار مرجع عام و خلائق ہو گیا۔

اب ان کی زندگی کارناموں' اور معجزوں پر لاتعداد کتابیں ہیں اور وہ محبت سے خواجہ صاحب کہلاتے ہیں اور ان کے مزار پر منتیں مانگنے کے لئے نہ صرف مسلمان بلکہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی جوق در جوق آتے ہیں ان کا سالانہ عرس بڑی شان و شوکت کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ ان کی وجہ سے اجمیر شہر کو بھی عزت مل گئی ہے اور اب اجمیر شریف کہلاتا ہے۔

متھ اسطرح سے بن جاتی ہے اور ایک مرتبہ جب لوگوں کے ذہن میں اس کی جڑیں بیٹھ جاتی ہیں تو یہ حقیقت کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور یہ مشکل ہو جاتا ہے کہ انہیں دوبارہ سے ان کی اصلی شکل اور حالت پر لایا جائے۔ عقیدہ کو صرف عقل کی بنیاد پر شکست دی

جا سکتی ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ہمارے مورخ کم ہی عقل کی راہنمائی پر ایمان رکھتے ہیں۔

فرقہ واریت اور ہیرو

اکثر پس ماندہ معاشروں میں شخصیتوں کی پرستش کی جاتی ہے کیونکہ ایسے ہی ماحول میں مفاد پرست جماعتیں اور لوگ اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر شخصیتوں کو استعمال کرتی ہیں۔ اور انہیں ہیرو کا درجہ دے کر ان کی پرستش کرتی ہیں۔ جب کہ یہ حقیقت ہے کہ ان میں سے وہ لوگ جنہیں بعد میں عظیم بنایا گیا یہ اپنے عہد اور وقت میں کبھی بھی اس قدر اہم نہیں تھے۔ اور ان کے ہم عصر انہیں بالاتر نہیں سمجھتے تھے۔ بعد میں مورخ انہیں گمنامی سے نکال کر لائے اور انہیں عظمت کا مقام دیا۔ لیکن شخصیتوں کو عظیم بنانے کا کام وقت کے تقاضوں کے تحت ہوتا ہے۔ جب تک یہ کچھ لوگوں کے مفادات کو پورا کرتی ہیں ان کی عظمت باقی رہتی ہے۔ اور جیسے ہی ان کی ضرورت ختم ہوتی ہے انہیں پھر سے فراموش کر دیا جاتا ہے۔

لیکن کچھ معاشرے اس قدر پس ماندہ ہوتے ہیں کہ ان کے ہاں تبدیلی نہ ہونے کی وجہ سے کچھ ہیروز ہمیشہ برقرار رہتے ہیں اور ان کی جگہ نئے ہیروز نہیں آتے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے معاشروں میں طبقاتی نظام ایک حالت میں برقرار ہے اس لئے یہ ہیروز ان کے مفادات کا تحفظ کرتے رہتے ہیں اور ان کو بدلنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

جب ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف جدوجہد آزادی کی ابتداء ہوئی تو قومی تحریک کو ایسی شخصیتوں کی ضرورت تھی کہ جنھوں نے انگریزوں سے مزاحمت کی ہو۔ تاکہ ان کے کارناموں کے ذریعہ ہندوستان کے ہزاروں ان پڑھ اور جاہل عوام کو متاثر کیا جا سکے اور انہیں قومی تحریک میں جذبہ اور جوش کے ساتھ شامل کیا جا سکے اور انہیں غیر ملکی حکومت کے خلاف لڑایا جا سکے۔ اس وقت تک چونکہ ہیروز کی کمی تھی اس لئے ان کو ابھارنے میں کسی مذہبی تعصب کا دخل نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ نے قوم پرستوں کو بہت سے ہیروز دیئے۔ چونکہ ان میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے اس لئے قوم پرستوں کی تحریک کو ان سے فائدہ پہنچا اور انہوں نے ان کی شخصیتوں کو خوب بڑھا چڑھا کر بڑے جذباتی انداز میں پیش کیا۔

ہیروز کی دوسری کڑی وہ تھی کہ جب ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرقہ وارانہ جذبات ابھرے ہو گئے اور دونوں جماعتوں نے اپنے اپنے ہیروز کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اس میں جن شخصیتوں کو سامنے لایا گیا وہ ایسے لوگ تھے کہ جو اپنے مخالفوں کے ساتھ لڑے تھے' مثلاً وہ ہندو جنھوں نے مسلمانوں کو شکست دی اور وہ مسلمان جنھوں نے ہندوؤں کو دبایا اور کچلا اس مقصدر کے لئے دونوں طرف سے تاریخ کو استعمال کیا گیا اور ایسے ہیروز کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لایا گیا۔ اور ان کی بہادری' جرات اور ہمت کے قصوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا۔

اس وجہ سے ایسی شخصیتیں جنہیں تاریخ اور زمانہ نے فراموش کر دیا تھا۔ وہ دوبارہ زندہ ہو گئیں۔ مثلاً شیوا جی کی سادھی' جس کے بارے میں لوگوں کو پتہ بھی نہیں تھا کہ کہاں ہے؟ اسے انگریز جیمس ڈگلس نے اپنی گائڈ میں جو اس نے بمبئی کے سلسلہ میں لکھی تھی' دریافت کیا اور یہ بتایا کہ شیواجی کی سادھی ویران پڑی ہوئی ہے اور اس کی دیکھ بھال کرنیوالا کوئی نہیں ہے۔ اس دریافت سے تلک نے فوراً فائدہ اٹھایا اور اس نے فوراً شیوا جی کو ایک عظیم شخصیت قرار دے دیا' اور اس کے کہنے کے مطابق شیوا جی کی عظمت کے ذریعہ مہاراشٹر بلند مرتبہ حاصل کرے گا اور مرہٹوں کو اس پر فخر ہو گا۔

بعد میں جادو ناتھ سرکار نے شیوا جی دی گریٹ اور اورنگ زیب پر کتابیں لکھ کر ان دو شخصیتوں کو بطور رقیب' یا دشمن پیش کیا اور ان دونوں کے درمیان تضاد کو ابھارا۔ اور یہی کچھ محمد بن قاسم' محمود غزنوی اور محمد غوری کے ساتھ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں نے اپنے اپنے ہیروز پر فخر کرنا شروع کر دیا اور ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایک دوسرے سے نفرت کرنا اور خون بہانا اپنا دستور بنا لیا۔ اس طرح سے فرقہ واریت کی جنگ صرف حال ہی میں نہیں لڑی گئی بلکہ یہ ماضی میں بھی لڑی گئی۔ اور یہ جنگ ان دونوں میں اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ یہ اپنے اپنے ہیروز کو باقی رکھیں گے اور ان کی عزت کرتے رہیں گے' اور انہیں مدد کے لئے بلاتے رہیں گے کہ وہ دوبارہ سے آئیں اور دشمنوں سے انتقام لیں۔ ان ہیروز کے اس کردار کی وجہ سے معاشرہ میں امن و امان اور یک جہتی کے جذبات کے بجائے تشدد و خوں ریزی کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔ اور یہ معاشرہ کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔

انقلاب اور ہیروز

ہر انقلاب ہیروز کو جنم دیتا ہے جو کہ عوام میں نہ صرف مقبول ہوتے ہیں بلکہ ان کی

عزت و احترام کیا جاتا ہے اور ایک حد تک ان کی پرستش کی جاتی ہے اور یہاں تک ان کا درجہ بڑھ جاتا ہے کہ ان کی ذات پر کسی قسم کی تنقید کی بھی اجازت نہیں ہوتی' اور یوں ان کے گرد تقدس کا ہالہ بنا دیا جاتا ہے۔

فرانسیسی انقلاب اس لحاظ سے بالکل مختلف ہے کہ اس نے اس قسم کے ہیروز پیدا نہیں کئے۔ سب سے پہلے تو یہ انقلاب ایک دم نہیں آیا۔ بلکہ کئی مرحلوں میں جا کر اس کی تکمیل ہوئی۔ اور ہر مرحلہ اور اسٹیج پر کئی جماعتیں' جو نظریاتی طور پر ایک دوسرے کی مخالف تھیں وہ باعمل رہیں' انہوں نے ایک دوسرے کی کمزوریوں پر سختی سے تنقید کی' اور ان کی سیاسی غلطیوں کی نشاندہی کی' چونکہ انقلاب نے ریاست کے تمام استحصالی اداروں کو ختم یا کمزور کر دیا تھا اس لئے اظہار رائے اور اختلاف کی آزادی ہر شخص کو تھی۔

انقلاب کے دوران سیاسی صورت حال اس قدر انتشار کا شکار تھی کہ کوئی ایک جماعت مکمل طور پر اقتدار پر اپنا قبضہ زیادہ دیر تک نہیں قائم رکھ سکی اس لئے اقتدار مختلف جماعتوں میں برابر منتقل ہوتا رہا۔ اور کسی کو یہ موقع نہیں ملا کہ وہ اپنے نظریات کو معاشرہ پر تھوپ دے۔ یہ وہ وجوہات تھیں کہ جس کی وجہ سے فرانسیسی انقلاب میں انقلاب کے بانیوں کا کوئی تصور پیدا نہیں ہوا اس انقلاب کے تمام بڑے بڑے ہیروز جن میں میرابو' مراٹ' دانتوں اور رابیس پیر شامل تھے' وہ اپنی عظمت قائم نہیں کر سکے۔ جیسے ہی ان کے ہاتھ سے اقتدار گیا ایسے ہی وہ زبردست تنقید کی زد میں آ گئے۔ اور ان میں سے بہت سے تو انقلابیوں کے ہاتھوں مارے گئے اور ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ انہوں نے انقلاب کے ساتھ غداری کی۔ چنانچہ اس کی وجہ سے فرانسیسی انقلاب کے تمام راہنما عام لوگوں کی طرح رہے اور مورخوں نے ان کی غلطیوں اور کمزوریوں کا تجزیہ کیا۔

اس کے برعکس امریکی اور روسی انقلابات کا رویہ مختلف رہا سب سے پہلے تو امریکہ کی جنگ آزادی کو امریکی انقلاب کا نام دیا گیا' جب کہ حقیقت میں یہ کوئی انقلاب نہیں تھا کیونکہ اس نے معاشرہ کے بنیادی ڈھانچہ کو نہیں بدلا اس لئے یہ نو آبادیات کے خلاف جنگ آزادی تھی' لہٰذا پہلے تو انہوں نے اسے انقلاب کہا اور اس کے بعد اس کے بانیوں کی ایک فہرست تیار کی جو کہ جلد امریکی تاریخ میں ہیروز بن گئے۔ چونکہ امریکی تاریخ بہت ہی مختصر ہے' اور اسے شخصیتوں کی ضرورت ہے اس لئے ان ہیروز نے اس ضرورت کو پورا کیا اور بہت جلد یہ امریکی قوم کے لئے باعث فخر بن گئے۔

لینن نے بھی روسی انقلاب کی کامیابی کے بعد یہ منصوبہ بنایا تھا کہ وہ انقلابی ہیروز کے

مجسمے تیار کرائے گا ان ہیروز کو اس نے یورپ کے مختلف ممالک سے ان کے انقلابی کردار اور سیاسی کارناموں کی وجہ سے چنا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح سے لوگوں کی سیاسی تربیت ہو سکے گی۔ ان میں جو ہیروز شامل تھے وہ مارکس' ا-ینگلز' لاسل' ہرذن' گیری بالڈی' رابیس پیر' د-انتوں اور کچھ ترقی پسند شاعر شامل تھے۔ کیمونسٹ حکومت نے خود لینن کو ایک دیوتا کا درجہ دیدیا اور اس کے جسم کو ایک شیشہ کے تابوت میں محفوظ کر کے لوگوں کی زیارت کے لئے رکھ دیا۔ اس کے بعد انقلاب نے اور ہیروز بنائے اور لوگوں کو پیچھے کی جانب دھکیل دیا۔

چین نے بھی انقلاب کے بعد بہت سے ہیروز بنائے لیکن ۱۹۶۰ء کی دھائی میں ثقافتی انقلاب کے دوران بہت سے ہیروز کو ختم کر دیا گیا اور بعد میں تو ماؤ کا درجہ بھی گھٹا دیا گیا اور اب جو سیاسی تبدیلیاں آئی ہیں اس نے بہت سی شخصیتوں کو گمنامی کے اندھیرے میں چھپا دیا ہے۔

روس اور مشرقی یورپ میں جو سیاسی تبدیلیاں آئی اس میں پرانے ہیروز پر بھی آفت آئی ' اور لوگوں کے غصہ کا شکار ان کے مجسمے ہوئے جو کہ یا تو گرا دیے گئے یا انہیں مسخ کر دیا گیا۔ اور اکثر مجسمے میوزیم میں رکھ دیئے گئے۔ اس نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ لوگوں پر جبر و تشدد کے ذریعہ کسی شخصیت کو مسلط نہیں کیا سکتا ہے۔

اس سے ایک سبق تو یہ ملتا ہے کہ انقلاب ہیروز کو بناتا ہے مگر آنیوالی نسلیں ان ہیروز کو ان کے مقام سے گرا کر قدموں میں لا ڈالتی ہیں۔ اس کے لئے لوگوں میں شعور کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جرات کی' مگر وہ معاشرے کہ جو ہیروز پر اعتماد کرتے ہیں اور اپنی تقدیر ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ایسے معاشروں میں لوگوں کا اپنا کردار اور ان کی اپنی توانائی ختم ہو جاتی ہے۔

جمہوریت اور ہیروز

تاریخ میں اب تک عظیم بننے کے لئے ضروری تھا کہ افراد جنگ کے راستہ کو اختیار کریں اور فتوحات و مال غنیمت کے ذریعہ اپنی بڑائی و عظمت کو لوگوں کے دلوں میں قائم کریں۔ جنگ جو اور فاتح کی عظمت جس قیمت پر حاصل کی جاتی ہے۔ یعنی لوگوں کا خوں بہا کر' اور ان کے گھر بار کو اجاڑ کر' اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اور ہیگل کے نظریہ کے مطابق وہ افراد جو تاریخ کی تشکیل کرتے ہیں انہیں اخلاقی اقدار کی پرواہ نہیں کرنی چاہئے۔

مقصد کا حصول ضروری اور اہم چیز ہے۔ وہ اخلاق اور اس کی قدروں سے بالا تر ہے۔ اور چونکہ عظیم آدمی دنیا میں خاص مقصد پورا کرنے آتے ہیں۔ لہٰذا ان کی شخصیت تنقید سے مبرا ہوتی ہے اور لوگوں کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کی پیروی کریں' اور وہ جس اہم مقصد کو پورا کرنا چاہتے ہیں اس کی تکمیل میں ان کی مدد کریں۔

ٹامس من نے فرد کی عظمت کے ان خیالات کو ذہن میں رکھے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کہ ان خیالات نے جرمن معاشرہ میں غیر جمہوری روایات کو فروغ دیا اور فرد اور عوام کے درمیان زبردست فاصلہ قائم ہو گیا۔ ہر اس معاشرہ میں کہ جہاں فرد کی عظمت کا تصور ہو گا۔ وہاں ایک طرف تو غلامانہ ذہنیت پیدا ہو گی اور دوسری طرف آمرانی ذہن مستحکم ہو گا۔

اگر دیکھا جائے تو فرد کی بڑائی ہمیشہ لوگوں کی قربانیوں پر رکھی جاتی ہے' اور اس عمل میں لوگ خام مال کی حیثیت رکھتے ہیں کہ جن کا بے دردی سے استحصال کیا جاتا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہوتی ہے کہ عظیم فرد کبھی بھی ان کی قربانیوں پر نہ تو رنجیدہ ہوتا ہے اور نہ پشیمان بلکہ وہ انہیں استعمال کرتا ہے اور اسے جائز سمجھتا ہے کہ اس نے اچھے نیک اور عمدہ مقاصد کے لئے لوگوں کی قربانی دی۔

جب لوگوں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے تو ضروری ہوتا ہے کہ انہیں وفادار' اطاعت گزار' اور وفاشعار بنا لیا جائے۔ اس کے نتیجہ میں لوگوں کا عقیدہ عظیم فرد کی ذات میں مستحکم ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بدلے میں انسانی نیکیوں پر ان کا ایمان کمزور پڑ جاتا ہے۔ لوگوں سے مسلسل یہ کہا جاتا ہے کہ فرد کو عظیم بنانے کے لئے وہ قربانی دیں' اپنی سہولتیں چھوڑ کر فرد کو شان و شوکت دیں۔ خود ذلت برداشت کریں مگر اپنے عظیم فرد کو طاقت و قوت دیں۔ اس لئے عظیم فرد کا تصور غیر جمہوری اور عوام دشمن ہوتا ہے۔ اور یہ آمریت و مطلق العنانیت کو مضبوط کرتا ہے ۔ اس کی وجہ سے لوگوں میں توانائیاں ختم ہو جاتی ہیں اور وہ اس قابل نہیں رہتے کہ کسی بھی قسم کی مزاحمتی تحریک چلا سکیں اور اپنے حقوق کے لئے جدو جہد کر سکیں۔

جب لوگ ہیروز پر اعتماد کرنے لگتے ہیں اور اپنی تقدیر اس کے حوالے کر دیتے ہیں تو ان میں خود بے حسی آ جاتی ہے اور وہ اپنے تمام مسائل کا حل ہیرو کی معجزانہ طاقت سے چاہتے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ انہیں تمام بحرانوں سے نجات دلائے گا۔ اور جب ایک مرتبہ لوگ اپنی طاقت و توانائی ہیرو کے سپرد کر دیتے ہیں تو ہیرو اپنی عظمت کے نام پر

انہیں ذلیل کرتا ہے۔ ان کے ساتھ حقارت سے پیش آتا ہے' اور جب وہ استعمال کے قابل نہیں رہتے تو انہیں کوڑے کرکٹ کی طرح سے پھینک دیتا ہے۔

پاکستانی معاشرہ کی ذہنی ساخت میں ہیروز کی پرستش موجود ہے کیونکہ یہ ماضی سے انہیں ورثہ میں ملی ہے۔ اور چونکہ ان کے معاشرہ کے سیاسی و سماجی اور معاشی حالات نہیں بدلے ہیں اس لئے یہ ماضی کے نظریات زندہ و توانا موجود ہیں۔ ہماری پوری تاریخ ہی افراد کے ذریعہ بیان کی جاتی ہے۔ مثلاً پاکستان کی تاریخ کو صرف دو جملوں میں بیان کر دیا جاتا ہے کہ : اقبال نے پاکستان کا خواب دیکھا' اور محمد علی جناح نے اس خواب کو عملی جامہ پہنا دیا۔ اور کوئی بھی یہ سوال نہیں پوچھتا کہ لوگ کہاں تھے؟ ہم نے کس کے لئے پاکستان بنایا تھا' اقبال کے لئے ' جناح کے لئے' یا لوگوں کے لئے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پاکستان سلطنت خداداد ہے۔ تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اس کے لئے کوئی جدوجہد نہیں کی گئی اور یہ وجود میں آگئی۔

تاریخ کے اس نقطہ نظر کی وجہ سے لوگ معجزوں پر یقین کرتے ہیں اور اس امید میں رہتے ہیں کہ کوئی مسیحا آئے گا اور انہیں نجات دلائے گا۔ چنانچہ ہمارا معاشرہ جب کبھی بھی بحرانوں میں گھرتا ہے اور مسائل سے دو چار ہوتا ہے تو ہم دعا کرتے ہیں کہ کوئی آئے اور ہماری مصیبتوں کا مداوا کرے۔ اسی لئے ہم یہ دعائیں سنتے رہتے ہیں کہ ہمیں پھر غازی صلاح الدین کی ضرورت ہے' محمد بن قاسم کی ضرورت ہے' اور محمود غزنوی کی ضرورت ہے جو کہ ہمارے بدلے میں ہمارے دشمنوں سے لڑیں۔ اس قسم کی ذہنیت جمہوری راہوں کو مسدود کرتی ہے اور آمرانہ نظام کے قیام میں مدد دیتی ہے۔

نقش قدم پر چلنا

ہمارے معاشرے میں یہ دستور ہے کہ ہم نوجوان نسل کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد اور عظیم افراد کے نقش قدم پر چلے اور اگر کوئی ان کے راستہ سے ہٹے یا ان کی تعلیمات پر تنقید کرے تو اسے بغاوت سمجھا جاتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا معاشرہ تبدیلی اور جدت سے کس قدر گھبراتا ہے اور اس کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے کہ اس کی فرسودہ روایات ختم ہوں اور ان کی جگہ نئے ادارے وجود میں آئیں اس لئے نئی نسل کو بزرگوں کے نقش قدم پر چلا کر پرانے نظام اور پرانے طریقوں کو قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

معاشرہ کے نظام کو ایک سا برقرار رکھنے کے لئے عظیم افراد اور ان کی تعلیمات و اقوال کام میں لائے جاتے ہیں۔ کیونکہ انکی شخصیتوں کے گرد تقدس کا ہالہ ہوتا ہے اس لئے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرنا آسان ہوتا ہے کہ ان کی کہی ہوئی بات کو صحیح سمجھیں اور ان کی تعلیمات پر اس لئے عمل کریں کہ ماضی میں بھی اچھی تھیں اور حال و مستقبل میں بھی اچھی رہیں گی۔ چونکہ ہمارے معاشرے میں اعلیٰ و ادنیٰ کی زبردست تمیز ہے اور اعلیٰ ہمیشہ درست اور صحیح بات کرتے ہیں اس لئے بچوں کو والدین کی اطاعت اور عوام کو راہنما کی اطاعت ضروری ہے۔ اس اندھی تقلید کے نتیجہ میں لوگ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو کھو بیٹھتے ہیں اور اس قابل نہیں رہتے کہ اپنے لئے نئی راہیں بنائیں یا تلاش کریں۔

چنانچہ ہمارے معاشرہ میں ہمیشہ اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ ہم عظیم افراد کے نقش قدم پر چل کر ہی فلاح و بہبود حاصل کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں بعض اوقات مشکل پیش آجاتی ہے کہ دائیں و بائیں بازو کی سیاسی جماعتیں ایک ہی قسم کی شخصیتوں کو لے کر ان کے اقوال یا تعلیمات کے ذریعہ اپنے نقطہ نظر کو پیش کرتی ہیں۔ اور لوگوں پر زور دیتی ہیں کہ وہ ان پر عمل کریں۔ مثلاً پاکستان میں اقبال اور محمد علی جناح کی شخصیتیں اس کی مثال ہیں۔ ایک طرف حکومت اور دائیں بازو کی جماعتیں ان کے اقوال زریں جو ٹی۔ وی' ریڈیو اور اخبارات میں مسلسل آتے رہتے ہیں اس کے ذریعہ اس کی تبلیغ کرتی ہیں کہ پاکستان ایک نظریے کے لئے بنا تھا' یہاں پر شریعت کا قیام ان کے منصوبوں میں سے ایک تھا اس لئے پاکستانی معاشرہ کو ان خوابوں کو پورا کرنا ہے اور ان کی تعلیمات پر عمل کرنا ہے۔

دوسری طرف بائیں بازو والے یہ کہتے ہیں کہ در حقیقت دونوں راہنما ان کے تھے مگر ان کو بائیں بازو والے اغوا کر کے لے گئے' ورنہ اقبال ایک طرف اجتہاد کی بات کرتے ہیں' ملا کو برا کہتے ہیں' اور عقلیت کا پرچار کرتے ہیں' جب کہ جناح ایک سیکولر پاکستان کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔

کون صحیح ہے اور کون غلط' اس بحث سے قطعہ نظر اہم بات یہ ہے کہ دونوں طرف سے اپنے خیالات کی تبلیغ کے لئے اور لوگوں کو آمادہ کرنے کے لئے شخصیتوں ان کے نظریات اور ان کی تعلیمات پر بھروسہ کیا جاتا ہے اور کوئی یہ کوشش نہیں کرتا کہ محض خیالات و نظریات کی بنیاد پر لوگوں کو راغب کرے اور ان کے ذہن کو بنائے ۔ مثلاً اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان کو ایک سیکولر ریاست اس لئے ہونا چاہئے کہ جناح نے قانون ساز اسمبلی کی پہلی تقریر میں ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔ جب کہ دوسری طرف سے جناح کی

تقریروں سے لاتعداد حوالے دیدیئے جاتے ہیں کہ جن میں دو قومی نظریہ کی بات کی گئی ہے۔

ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں اور حکومت یہ سمجھتی ہیں کہ لوگ کٹھ پتلیوں کی مانند خاموش اور بے حس ہیں اس لئے انہیں ڈور ہلا کر متحرک کرنا ہے اور یہ ان کے مفاد میں ہے کہ وہ اپنے قائدین کے نقش قدم پر چلیں' اگر جناح انہیں حکم دیں کہ وہ سیکولر ہو جائیں تو پوری قوم کو بغیر سوچے سمجھے اس حکم کی تعمیل کرنی چاہئے۔ اگر وہ کہیں کہ لوگ مذہبی و راسخ العقیدہ ہو جائیں تو بھی یہ لوگوں کا فرض ہے کہ اس پر عمل کریں۔

ہمارے دانشور کبھی یہ نہیں کہتے کہ نظریاتی مملکت یا سیکولر ریاست بذات خود اچھی یا بری ہے کیونکہ کوئی بھی معاشرہ کسی کے حکم دینے سے نہ تو سیکولر ہو جاتا ہے اور نہ مذہبی' اس کے لئے اس کے ڈھانچہ کو بنیادی طور پر بدلنا ضروری ہوتا ہے' اور اس کے نتیجہ میں لوگوں کی ذہنیت بدلتی ہے اور نئے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ کوئی اس کا تجزیہ نہیں کرتا کہ ہمارے معاشرے کو جمہوریت' سیکولرازم' یا لبرل ازم کی کیوں ضرورت ہے؟

اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ نظریات کو افراد کے ذریعہ نہیں بلکہ ان کے عمل کو مدنظر رکھ کر لوگوں کے سامنے بیان کیا جائے۔ اور انہیں سمجھایا جائے کہ کیوں جمہوریت اور سیکولرازم ضروری ہیں۔ اس لئے کہ یہ معاشرہ کو ذہنی غلامی سے نجات دلائیں گے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ عظیم افراد کے پنجوں سے چھڑائیں گے۔

ہیرو شکنی

مغربی تہذیب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تبدیلی کا عنصر ہے جس کی وجہ سے تہذیب جاندار اور توانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کا علم بھی مغرب میں ٹھہرا ہوا نہیں ہے بلکہ اس میں مسلسل نئے نقطہ نظر آتے رہے ہیں اور نئے نظریات اس کو مزید دلکش بناتے رہتے ہیں۔ تاریخی نظریات کی تبدیلی کے اس عمل میں ماضی کی تشکیل نو ہوتی رہتی ہے اور ہیروز کو ایک زمانہ میں جو عظمت حاصل تھی وہ کم ہو جاتی ہے یا ختم ہو جاتی ہے اور اس کا بلند و بالا مرتبہ گر کر بالکل نیچے آ جاتا ہے۔ اور یہ بڑا دلچسپ اور سنسنی خیز عمل ہوتا ہے کہ جب ایک مقدس اور بزرگ تر فرد کو ایک عام آدمی میں تبدیل کر دیا جائے اور اس کے ارد گرد قائم کئے ہوئے تمام مفروضوں کو توڑ دیا جائے۔ اس سے لوگوں میں یہ آگہی پیدا ہوتی ہے کہ تاریخ میں جو کچھ حاصل کیا جاتا ہے۔ وہ کسی خاص الوہی یا مافوق الفطری خوبیوں

کی وجہ نہیں بلکہ عام لوگ ہی معاشرہ کی مدد سے اور لوگوں کی مدد سے کارنامے سرانجام دیتے ہیں۔

امریکہ اور یورپ میں حال ہی میں ایسی بہت سی کتابیں چھپی ہیں کہ جنہوں نے ماضی کے بہت سے ہیروز کو عام انسانوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ ان میں اگناشس لویلا' کولمبس اور نیوٹن قابل ذکر ہیں۔ لویلا کی سوانح حیات فلپ کارمن نامی ایک مورخ نے اس کی ۵۰۰ ویں برسی کے موقع پر لکھی ہے۔ لویلا کو-نٹر ریفارمشن کے بانیوں میں سے تھا اور اس نے پروٹسٹنٹ تحریک سے جو چیلنج پیدا ہوئے تھے ان کا موثر جواب دیا تھا۔ اس نے سوسائٹی آف جیسس کے نام سے جو جماعت بنائی تھی اس نے کیتھولک عقیدہ کے لوگوں میں ایک نیا جذبہ پیدا کیا تھا' اس لئے کیتھولک کی نظروں میں وہ ولی اللہ بن گیا۔ اور تاریخ میں اس کا خاکہ پرہیزگار اور سپاہی کے طور پر بنایا گیا۔ کارمن کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگناشس کو جو کامیاں ہوئی وہ اس کی مافوق الفطرت خوبیوں کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ اس لئے ہوئی کہ معاشرہ کے کچھ طبقوں کو اس کی ضرورت تھی' وہ ولی اللہ نہیں تھا بلکہ ایک عام آدمی تھا کہ جس میں تمام انسانی کمزوریاں تھیں۔

اسی طرح سے کولمبس اب امریکی تاریخ کا سب سے بڑا متضاد شخص بن گیا ہے۔ ۱۹۹۲ء میں اس کی "امریکی دریافت" کی ۵۰۰ ویں سالگری منائی جا رہی ہے۔ اس کی اس نام نہاد دریافت پر سب سے زیادہ احتجاج امریکہ ریڈ انڈین کر رہے ہیں کہ جنہیں بقول روائتی مورخین کے کولمبس نے دریافت کیا تھا۔ اب مورخ ان اصلاحات پر بحث کر رہے کہ جیسے کہ "دریافت" اور "نئی دنیا" اور یہ دلیل دے رہے ہیں کہ یہ ممالک دریافت نہیں ہوئے ہیں بلکہ انہیں فتح کیا گیا اور پھر نو آبادیات میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس لئے اب کولمبس کی مہم جوئی کو ان الفاظ اور اصلاحات میں بیان کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ جن سے امریکہ قدیم کے باشندے ناراض نہ ہوں۔ اس لئے اس کی سالگرہ کے لئے اب انگریزی لفظ Celebrate کی بجائے جوبلی استعمال کیا جا رہا ہے (یہ عبرانی کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کہ کسی واقعہ کی یاد منانا کہ جس موقع پر اپنی غلطیوں پر پشیمان ہوا جائے) اسی طرح فائٹنگ (Fighting) کے بجائے انکونٹر (Encounter) کو استعمال کیا جا رہا ہے۔

ایک مورخ کرک پیٹرک سیل نے کولمبس پر نئی کتاب لکھی ہے اس نے اس پر زبردست تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ پہلا یورپی تھا کہ جس نے امریکیوں کو غلام بنایا اور ۷۰ ملیون انسانوں کا خون کیا۔ وہ ایک لحاظ سے پاگل شخص تھا کہ جس نے ٹینوز' ایزٹک'

اور انکاز کا قتل عام کیا لیکن سیل وہ پہلا مورخ نہیں کہ جس نے کولبس کے جرائم سے پردہ اٹھایا ہو۔ ڈاکٹر جانئس نے ۱۷۵۹ء میں کولبس پر لکھتے ہوئے ان کے جرائم کے بارے میں لکھا تھا کہ جب کسی کمزور قوم میں طاقت ور قوم کے لوگ آ جاتے ہیں تو وہ کسی قدر بربریت اور درندگی کا مظاہرہ کرتے ہیں' ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا جاتا ہے' ان کے شہروں سے انہیں نکال دیا جاتا ہے' ان کو خوف زدہ کرنے کے لئے قلعے تعمیر کئے جاتے ہیں' اور اس قدر فوجی طاقت حاصل کر لی جاتی ہے کہ انہیں وہاں سے نکالنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ ان کے ملک میں مالک و خود مختار ہو جاتے ہیں' اور ان کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے لگتے ہیں۔ یورپیوں کو انڈین نے دعوت نہیں دی تھی' بلکہ یہ لوگ بغیر بلائے وہاں گئے تھے۔ اور ان لوگوں کے درمیان گئے تھے کہ جنہیں قطعی یہ علم نہیں تھا کہ ان کے ملک کے علاوہ بھی اور ملک ہیں اور دوسری ایسی قومیں ہیں کہ جو ان سے بالکل علیحدہ فطرت رکھتی ہیں۔ ان لوگوں کو نہ صرف لوٹا کھسوٹا گیا بلکہ اس کے بعد جھوٹ بھی بولا گیا۔

زیادہ عرصہ کی بات نہیں کہ جب مارشل ٹیٹو اقتدار میں آیا تو اس کے گرد عظیم شخصیت کا تانا بانا بنایا گیا' اور اسے سپرمین کا درجہ دیدیا گیا۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد' اور روس و مشرقی یورپ میں سیاسی تبدیلیوں کے بعد ایک نئی تصویر سامنے آئی۔ اس پر دو تازہ کتابیں چھپی ہیں ایک کا عنوان ہے "ٹیٹو کی عورتیں" اور دوسری ہے "ٹیٹو کا بدبیئت ورثہ" اس میں بتایا گیا ہے کہ وہ ایک بدعنوان اوباش اور عیاش انسان تھا۔ جس نے کہ نازیوں سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ جب یوگوسلاویہ کے ایک نوجوان سے ان کتابوں کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ' "بوڑھے لوگوں کے لئے یہ شاید صدمہ کا باعث ہوں' لیکن نوجوان لوگ اس کے بارے میں بالکل نہیں سوچتے' ان کے لئے وہ ماضی کی ایک یادگار ہے"

پاکستان میں تحقیق کے مسائل

سماجی اور سائنسی علوم میں تحقیق کے ذریعہ لوگوں میں تنقید' اور کھوج کا احساس پیدا ہوتا ہے' اسی لئے کسی بھی معاشرہ کی ذہنی ترقی' نشوونما' اور ترقی کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس میں ایسی تحقیق کی سرپرستی کی جائے کہ جو مذہب' سیاست' اور سماجی دباؤ سے آزاد ہو' اور ہر نقطہ نظر کو اظہار کی پوری پوری آزادی ہو۔ ایک محقق کو اس کے مواقع ہوں کہ وہ بلا کسی خوف اور خطرے کے اپنی بات کہہ سکے' کیونکہ بحث و مباحثہ' تنقید' اور آپس کے تبادلہ خیالات کے ذریعہ ہی ذہنوں میں وسعت ہو گی اور اس سے لوگوں میں اپنے خلاف بات سننے اور تنقید کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا ہو گا' اور اس کے ذریعہ یہ مواقع پیدا ہوں گے کہ معاشرے کے مسائل کا واضح اور کھلے طور پر تجزیہ کیا جا سکے۔ کیونکہ تحقیق کے لئے ضروری ہے کہ ان مسائل پر کرے کہ جن کا تعلق معاشرہ کے معاملات اور مسائل سے ہو' کیونکہ وہ تحقیق جو ان مسائل سے الگ ہو کر کی جائے گی۔ وہ معاشرہ میں غیرموثر رہے گی' اور اس کے کوئی نتائج نہیں نکلیں گے۔

پاکستان میں تحقیق اس لئے بھی متاثر ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں کوئی سیاسی استحکام نہیں ہے اور آئے دن نئی نئی سیاسی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ کیونکہ جو بھی نئی حکومت آتی ہے اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ادیبوں اور دانشوروں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ ایسے موضوعات پر لکھیں کہ جو ان کی پالیسیوں کی حمایت کریں۔ اور ان کے اقتدار کو اس سے سہارا ملے۔ کیونکہ ہمارے اکثر محقق اور دانشور حکومت کے اداروں میں کام کرتے ہیں اس لئے وہ اس بات پر مجبور ہوتے ہیں کہ اپنی ملازمتوں کو بچانے اور ترقی کی خاطر اپنے ضمیر کے خلاف لکھیں۔ اس صورت میں ان کا کردار محقق اور دانشور کا نہیں رہتا ہے بلکہ وہ بیوروکریٹ اور حکومت کے ترجمان بن جاتے ہیں۔

میں چونکہ جو یونیورسٹی میں پڑھاتا رہا ہوں۔ اس لئے مجھے اندازہ ہے کہ یونیورسٹی اور حکومت کے اداروں میں کس طرح سے تحقیق ہوتی ہے۔ خاص طور سے تاریخ میں جو کچھ ہوا ہے' اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے مورخوں کو بہت کم یہ جرات ہوتی ہے کہ وہ حکومت کے نقطہ نظر سے اختلاف کریں' اور جو سرکاری تاریخ کا دائرہ ہے اس سے انحراف کریں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ تاریخ میں نظریہ کا دفاع ہمارے بیوروکریٹس کرتے ہیں اور اس پر نظر رکھتے ہیں کہ کوئی اسکالر اس کی خلاف ورزی نہ کرے۔

مثلاً ایک کانفرنس میں، پاکستان ہسٹاریکل اینڈ کلچرل ریسرچ کے انسٹی ٹیوٹ میں اس بات پر اعتراض کیا گیا کہ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے شاہ ولی اللہ پر جو ایک کتاب چھپی ہے اس میں ان پر تنقید کی گئی ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جنرل نے، جو کہ خود ایک مورخ تھے، معذرت کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب ان کے آنے سے پہلے چھپی تھی، اور یہ کہ وہ اس کتاب کو واپس لے لیں گے اور اس کی سرکولیشن نہیں ہونے دیں گے، اس کے بعد انہوں نے یہ یقین دلایا کہ آئندہ سے ایسے اقدامات کئے جائیں گے اس قسم کی کتابیں انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے شائع نہ ہوں۔ انہوں نے اپنے وعدہ کو قائم رکھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس انسٹی ٹیوٹ نے کسی قسم کی عمدہ تحقیق تاریخ اور ثقافت میں نہیں چھاپی۔

مجھے اس سلسلہ میں اپنا ایک واقع بھی یاد آتا ہے کہ جب میں نے محمد بن قاسم کے بارے میں یہ بیان دیا کہ اس کا سندھ پر حملہ جارحیت تھی، تو سندھ یونیورسٹی کے کچھ اساتذہ نے اس وقت کے وائس چانسلر سے یہ مطالبہ کیا کہ مجھے اس قسم کا بیان دینے کی وجہ سے یونیورسٹی سے نکال دیا جائے۔ چنانچہ اکثر یہ تلوار سر پر لٹکتی رہتی ہے۔ اور اس خوف سے اکثر اسکالرز خاموش رہتے ہیں۔

اس لئے ظاہر ہے کہ جب تک نجی ادارے نہ ہوں، اور اسکالرز مالی طور پر آزاد و بے فکر نہ ہوں اس وقت تک کسی قسم کی تحقیق ممکن نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اگرچہ کافی دولت مند اور امیر لوگ موجود ہیں۔ مگر ان میں سے کسی کو اس اہمیت کا احساس نہیں کہ جمہوریت اور سیکولر روایات کو فروغ دینے کے لئے کچھ ادارے بنائے جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ خود جمہوری اور سیکولر روایات پر یقین نہیں رکھتے، جب کہ مذہبی اداروں کو قائم کرنے میں یہ لوگ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

پاکستان کی یونیورسٹیوں میں اب تک اگر کسی موضوع پر کام ہو رہے تو وہ مطالعہ پاکستان ہے، اور اس پر بھی ساری تحقیق حکومت کے بنائے ہوئے نقطہ نظر کے تحت ہوئی ہے اور سارا زور دو قومی نظریہ پر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تحریک آزادی کے دوسرے تمام پہلوؤں کو یکسر نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ تحقیق نہ تو تاریخ کی کئی تعبیر کرتی ہے، نہ نئے چیلنج دیتی ہے، اور نہ ہی نئے تصورات و نظریات کو پیش کرتی ہے۔

ہماری یونیورسٹیوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی موضوع پر بار بار تحقیق ہوتی رہتی ہے، اور اس کے لئے نہ تو نیا مواد استعمال کیا جاتا ہے، نہ نیا نقطہ نظر دیا جاتا ہے، مثلاً "تحریک آزادی میں سندھ کا حصہ" پر چھ یا آٹھ تھیس لکھے جا چکے ہیں اور یہ سب ایک

ہی مواد اور ایک ہی نقطہ نظر کو پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی میں کوئی نئی بات یا نئی تحقیق نہیں ہوتی ہے، دوسرا موضوع سندھ کی بمبئی سے علیحدگی ہے، اس میں بھی ایک ہی مواد کو سامنے رکھ کر اسے سندھی مسلمانوں کے نقطہ نظر سے لکھا گیا ہے۔

اس کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ایک طرف تو ڈگریاں حاصل کرنے کے لئے سندھ، سرحد، اور بلوچستان میں ان موضوعات پر تحقیق کرائی جا رہی ہے کہ جو ان صوبوں کے اس پہلو کو اجاگر کرے کہ جس سے پاکستان کی تحریک مضبوط ہوئی، جب کہ دوسری جانب ان صوبوں میں پاکستان اور اس کی مرکزیت کے خلاف جذبات بڑھ رہے ہیں، اس لئے ان تحقیقات کا لوگوں کے ذہن پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے، لوگ اس میں دلچسپی رکھتے ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد کیا ہوا؟ کیوں یہاں کا سیاسی نظام ناکام ہوا؟ فوج اور بیوروکریسی کیوں طاقت ور ہوئی؟ چونکہ ان تحقیقات کا تعلق معاشرہ کے مسائل سے نہیں ہے، اس لئے انہیں کوئی پڑھتا بھی نہیں ہے، اور ان میں سے اکثر شائع شدہ کتابیں اسٹوروں میں پڑی گلتی سڑتی رہتی ہیں۔

یہی صورت حال اس وقت ہوتی ہے کہ جب ریسرچ اسکالرز کو ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے موضوعات دیئے جاتے ہیں، ان موضوعات کو دینے سے قبل پوری طرح سے چھان بین کی جاتی ہے کہ یہ حکومت اور اس نظریہ کے خلاف نہ ہوں۔

ان تمام رکاوٹوں کے باوجود ہماری حکومتیں مطمئن نہیں ہیں، اور اس لئے برابر ایسے قوانین بنا رہی ہیں یا آرڈیننس جاری کر رہی ہیں کہ جو تحقیق کو اور زیادہ مشکل بنا رہے ہیں، مثلاً ابھی یہ قانون پاس ہوا ہے کہ جو بھی تحریر نظریہ پاکستان کے خلاف ہو گی، اس کی سزا دس سال قید بامشقت ہو گی، ان حالات میں پاکستان کے اسکالرز کے لئے آزادانہ تحقیق ناممکن ہو کر رہ گئی ہے، اور اس لئے اب جو بھی ہماری تاریخ اور ثقافت پر نیا کام ہو رہا ہے وہ غیر ملکی یونیورسٹیوں میں ہو رہا ہے۔

تحقیق پر ان رکاوٹوں کے ذریعہ ہماری حکومتیں اپنی زندگی کو شاید بڑھا لیں۔ مگر معاشرہ کو جاہل اور گمراہ کر کے یہ قوم کے مستقبل کو اندھیرا بنا رہی ہیں اور جو قومیں اندھیرے میں تنگ ذہن کے ساتھ پرورش پاتی ہیں، وہ دوسری قوموں سے کسی قسم کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہیں۔

جاگیردارانہ سیاست

ہندوستان کے جاگیرداروں اور امراء کے بارے میں ایک برطانوی افسر نے ۱۸۶۰ء کی دہائی میں یہ لکھا تھا کہ مغلوں کے دور حکومت سے اس طبقہ میں یہ روایت رہی تھی کہ یہ اپنے خاندان میں کسی ایک فرد کو مسلمان ہونے دیتے تھے تاکہ اس طرح سے انہیں دربار کی حمایت مل جائے اور اس ایک فرد کی قربانی سے ان مراعات اور جائدادیں محفوظ ہو جائیں' یہی کچھ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں اس طبقہ کا کردار رہا کہ ایک ہی خاندان کے کچھ لوگ باغیوں سے مل گئے اور کچھ برطانوی حکومت کے وفادار رہے۔ اور ان کی یہ پالیسی وقت کے ساتھ بدلی نہیں بلکہ اس طرح سے جاری رہی تاکہ ہر صورت میں ان کے خاندان کا تحفظ ہو سکے۔

اس لئے جاگیردارانہ طبقہ کی برصغیر ہندوستان میں یہ تاریخ رہی ہے کہ انہوں نے کبھی بھی کسی مقصد' اور مشن کی خاطر کسی کا ساتھ نہیں دیا بلکہ اس کے پس منظر میں ہمیشہ ان کے مفادات کا تحفظ ہوتا تھا۔ وہ جب بھی کسی سیاسی جماعت کے رکن بنتے تھے تو اس لئے نہیں کہ انہیں جماعت کے اغراض و مقاصد یا اس کے منشور سے اتفاق ہوتا تھا' بلکہ اس لئے کہ اس جماعت کے ذریعہ وہ اپنی حیثیت کو مضبوط کر سکتے تھے یا برقرار رکھ سکتے تھے۔ اور اگر کبھی دو جماعتیں برابر کی طاقت ور ہوں' اور ان کے اقتدار میں آنے کے مواقع بھی برابر کے ہوں تو اس صورت میں خاندان کے افراد دونوں جماعتوں میں شمولیت اختیار کر لیتے تھے۔

جب ہندوستان میں برطانوی حکومت مستحکم ہو گئی اور اس کے خلاف کوئی موثر مخالفت باقی نہیں رہی تو جاگیردار طبقہ نے مکمل طور پر ان کی حمایت شروع کر دی اور ان کے لئے کام کرنا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے وہ ان کے وفاداروں میں شامل ہو گئے۔ جب ۱۸۸۵ء میں کانگرس قائم ہوئی' تو ہندوستان کا جاگیردار طبقہ اس سے دور رہا' کیونکہ انہیں یقین نہیں تھا کہ کانگرس کسی بھی طرح سے ان کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔ لیکن جب ہندوستان میں قومی تحریکیں آہستہ آہستہ طاقت ور ہونا شروع ہوئیں' اور حکومت نے بھی ان کے مطالبات پر غور کرنا شروع کر دیا' تو اس وقت اس طبقہ کے نوجوانوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا' چنانچہ یہ ہوا کہ ایک ہی خاندان کے کچھ لوگ حکومت کی ملازمتیں کرتے رہے اور کچھ لوگ سیاسی میدان میں آ گئے' اور اس طرح سے ماہرانہ انداز

میں انہوں نے توازن کو اپنے حق میں برقرار رکھا۔

اس کا ایک نتیجہ اور یہ نکلا کہ آزادی کے بعد پاکستان میں اس طبقہ کے افراد نے یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا کہ انہوں نے قومی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور ملک کی آزادی کے لئے مالی و اخلاقی قربانی دی تھی' اس لئے نہ صرف ان کی عزت کی جائے بلکہ اس صلہ میں انہیں مراعات بھی دی جائیں۔

ملک کی تقسیم کے بعد جاگیردار طبقہ اس وقت تک مسلم لیگ کے ساتھ رہا' جب تک کہ وہ سیاسی طور پر مضبوط رہی اور اقتدار اس کے پاس رہا۔ مگر جیسے ہی مسلم لیگ کمزور ہونا شروع ہوئی اور دوسری جماعتیں بننا شروع ہوئیں' تو اس طبقہ نے وہی اپنی پرانی پالیسی کو اختیار کر لیا' اور انہوں نے کئی جماعتوں میں شمولیت اختیار کر لی۔

چنانچہ اس وقت پاکستان میں اس طبقہ کے لوگ فوج' بیوروکریسی' اور سیاسی جماعتوں میں ہیں' کیونکہ اقتدار بھی انہیں تین اداروں میں رہتا ہے۔ اس لئے ان کے لئے کبھی یہ مسئلہ نہیں ہوتا کہ کون سی جماعت اقتدار میں ہے' اور کس قسم کی حکومت قائم ہے' یعنی جمہوریت ہے کہ مارشل لاء۔

چونکہ یہ طبقہ ہر گروپ اور ہر نظام میں طاقت ور ہوتا ہے' اور سیاست میں موثر کردار ادا کرتا ہے اس لئے کوئی بھی حکومت اقتدار میں آئے وہ معاشرہ کے سیاسی' سماجی' اور معاشی ڈھانچہ کو بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کرتی ہے۔ یہاں تک کے وہ حکومت بھی کہ جو سوشل ازم کا نعرہ لگا کر اقتدار میں آئی تھی' وہ بھی جاگیرداروں کے خلاف کوئی اصلاحات نہیں کر سکی۔ اور وہ تمام سیاسی اتار چڑھاؤ کے باوجود دیہاتوں میں اپنی حویلیوں' گڑھیوں' میں اپنی نجی فوجوں کی حفاظت میں محفوظ اور امن و امان کی زندگی گزارتے رہے۔ ملک کی انتظامیہ ان کے زیر اثر ہے' اور ان کے احکامات پر چلتی ہے' اور ان کا یہ ظالمانہ راج ان کی جاگیروں اور دیہاتی علاقوں میں اس لئے رہتا ہے کہ ہر سیاسی جماعت کو الیکشن جیتنے کے لئے ان کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس لئے پاکستان کی تقریباً تمام سیاسی جماعتوں پر جاگیرداروں کا قبضہ ہے' چونکہ ان کا کسی قسم کا کمٹ مینٹ نہیں ہوتا اس لئے ان کے لئے کچھ مشکل نہیں ہوتا کہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنے نظریات بدل لیں اور کبھی سوشلسٹ ہو جائیں۔ کبھی سیکولر اور کبھی مذہبی اور اسلام کے دلدادہ۔ اور ان کے لئے یہ بھی کبھی مسئلہ نہیں رہا کہ وہ ایک پارٹی چھوڑ کر دوسری پارٹیوں کو اختیار کر لیں' اس لئے پاکستان میں اب یہ کوئی تعجب کی بات

نہیں رہی ہے کہ ایک ہی شخص ایک وقت میں سوشلسٹ تھا اور وہی شخص کچھ مہینوں میں بنیاد پرست بن گیا اور اس پر مذہب کی خوبیاں اچانک واضح ہو گئیں۔ سیاسی موقع پرستی اس طبقہ کی وہ اہم خصوصیت ہے کہ جس پر یہ فخر کرتے ہیں۔

سیاسی جماعتوں میں جاگیرداروں کے تسلط کی وجہ سے یہ جماعتیں ایسے کوئی منشور نہیں بناتیں کہ جو ان کے مفادات کے خلاف ہوں' اور اکثر تو کوئی منشور سازی ہی نہیں کرتیں' کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ الیکشن جیتنے کے لئے منشور سے زیادہ جاگیردار کا اثر و رسوخ ضروری ہے۔ کیونکہ تقسیم سے پہلے اس روایت کی ابتداء مسلم لیگ نے کر دی تھی اور صرف انہیں جاگیرداروں کو ٹکٹ دیئے تھے کہ جن کا جیتنا یقینی تھا۔ اس لئے الیکشن میں دراصل پارٹی نہیں جیتتی بلکہ جاگیردار جیتتے ہیں۔

یہ جاگیردار سیاستدان عوام کے ساتھ دھوکہ کرتے ہیں' اور خود جاگیردارانہ سیاست میں ان غداروں کی نشان دہی کی جاتی ہے' مگر بہت جلد یہ کوشش کی جاتی ہے کہ ان کے گناہوں کو معاف کر دیا جائے اور انہیں معاشرہ اور تاریخ میں باعزت مقام دیدیا جائے' اور یہ کام بھی خود جاگیردار راہنما ہی کرتے ہیں تاکہ ان کے طبقہ کی تصویر صاف ستھری رہے۔ اس کی ایک مثال سندھ کے جاگیردار راہنما جی۔ ایم۔ سید سے دی جا سکتی ہے جو انہوں نے ۱۹۶۹ء میں سندھ متحدہ محاذ کے پلیٹ فارم سے کی تھی' اور اس میں انہوں نے ون یونٹ کے نتیجہ میں ہونیوالی خرابیوں کا ذکر کیا تھا کہ جس سے سندھ دوچار ہوا تھا۔ اس موقع پر انہوں نے ایوب کھوڑو کی شخصیت کو دوبارہ سے بہتر بنانے کی کوشش کی جب وہ ون یونٹ بنانے میں سب سے آگے تھا' لیکن جی۔ ایم۔ سید نے اس کی ون یونٹ کی سیاست کو نظرانداز کر کے اس کے اس عمل کی تعریف کی کہ جو اس نے سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کے سلسلہ میں کی تھی' اور اس کی تعریف کی کہ اس نے پاکستان کی تقسیم کے بعد کراچی کو سندھ سے علیحدہ کرنے پر احتجاج کیا تھا' اور جی۔ ایم سید کے مطابق اس ون یونٹ بنانے میں حصہ تو لیا مگر اسے اس کا احساس نہیں تھا کہ اس سے سندھ کو کیا نقصانات ہوں گے' لیکن جیسے ہی اسے اس کا احساس ہوا وہ ون یونٹ کے منصوبہ سے علیحدہ ہو گیا۔ جی۔ ایم سید اور ان کے جاگیردار سیاستدان یہ سمجھتے ہیں کہ جیسے تاریخ کے فیصلے وہ کرتے ہیں' کہ جب جس کو چاہیں ملزم قرار دیدیں اور جب چاہیں اسے باعزت طور پر بری کر دیں۔ جب چاہیں کسی کو غدار کہہ دیں اور جب چاہیں وہ محب وطن ہو جائے۔ اور یہ اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں معلوم ہے کہ اس جاگیردارانہ سیاست میں ان کی دلیلوں کو

چیلنج کرنیوالا کوئی نہیں ہے۔

جی۔ ایم۔ سید ہی نے اپنی اس تقریر میں ذوالفقار علی بھٹو کا ذکر کیا کہ جب وہ پاکستان واپس آئے تو ون یونٹ کے خلاف تحریک میں حصہ لیا' مگر جیسے ہی ایوب خاں نے انہیں وزارت کی پیش کش کی انہوں نے تحریک چھوڑ کر ایوب خان کی پیش کش کو قبول کر لیا' اور بڑی وفاداری کے ساتھ آمریت کے لئے کام کیا' اور جب ایوب خاں کا فاطمہ جناح سے مقابلہ ہوا تو اس میں بھٹو ایوب کی حمایت میں سب سے آگے تھے۔ اور جب ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ایوب خاں کی مقبولیت کم ہوئی تو بھٹو اس کے مخالف بن کر عوام میں ہیرو ہو گئے اور جب انہوں نے حکومت بنا لی تو ان کا وہ سارا دور کہ جو انہوں نے ایوب خاں کی خدمت میں گذارا تھا وہ بھلا دیا گیا' اور روٹی' کپڑے' اور مکان والا بھٹو یاد رہ گیا۔ اس کے بارے میں جی۔ ایم۔ سید کی یہ رائے ہے کہ اگرچہ وہ امیر خاندان اور عیش و آرام کا دلدادہ تھا مگر اس نے اصولوں کی خاطر جیل کی تکالیف اٹھائیں۔

اس کی ایک اور مثال پیر علی راشدی کی ہے جو سیاست میں اپنی موقع پرستی کی وجہ سے مشہور تھے اور جو ایوب خاں کو پاکستان کا بادشاہ بننے کا مشورہ بھی دے چکے تھے' اور بعد میں بھی اس کے قائل تھے کہ پاکستان کے مسائل کا حل بادشاہت میں ہے' انہیں ہی کی تعریف کرتے ہوئے جی۔ ایم۔ سید نے کہا کہ انہوں نے ایوب خاں کی آمریت کے خلاف ایک اخبار میں مسلسل آرٹیکل لکھے کہ جو ان کا قابل تعریف کارنامہ ہے۔ اور جسے کبھی نہیں بھلایا جا سکتا ہے۔

لہٰذا سیاست کے اس اتار چڑھاؤ میں اپنی موقع پرستی' دھوکہ دہی' اور عوام سے غداروں کے باوجود یہ جاگیردار سیاستدان آخر محب وطن اور عوام کے مخلص نمائندے بن کر ابھرتے ہیں' ان کے اصلی کردار اور اس کے خدوخال کو نمایاں کرنے والا کوئی نہیں ہوتا ہے۔

تعلیم کچھ کے لئے

ہندوستان کے معاشرے میں یہ ابتداء سے رواج تھا کہ امراء اپنے بچوں کو تعلیم کی غرض سے اسکولوں' مدرسوں' یا پاٹھ شالاؤں میں نہیں بھیجا کرتے تھے' کیونکہ یہ صرف غریبوں اور نچلے طبقوں کے بچوں کے لئے ہوتے تھے' اور امراء کے لئے یہ انتہائی اذیت ناک تھا کہ ان کے بچے' نچلے طبقوں کے بچوں کے ساتھ گھل مل کر تعلیم حاصل کریں۔ لہٰذا دستور یہ تھا کہ ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت گھروں پر ہوتی تھی اور اس مقصد کے لئے مختلف علوم کے ماہرین کو ملازم رکھا جاتا تھا۔ اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ بادشاہ اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے محل میں اسکول قائم کر دیتا تھا کہ جہاں امراء کے بچے بھی ان کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔

اس رجحان کا تعلق اس وقت کے طبقاتی نظام سے تھا کہ جس میں طبقہ اعلیٰ اور ادنیٰ درجہ کے لوگوں میں کوئی سماجی تعلقات نہیں ہوتے تھے' اور ان کے درمیان ایک فاصلہ برقرار رہا کرتا تھا۔ اس وجہ سے وہ اساتذہ جو امراء کے بچوں کو ان کے گھروں پر جاکر پڑھایا کرتے تھے' ان کی سماجی حیثیت بھی ان ملازموں کی طرح تھی جو ان کے محلات میں کام کرتے تھے۔ کیونکہ عزت علم اور صلاحیت کی بنیاد پر نہیں ہوتی تھی' بلکہ دولت' اور طاقت کی بنا پر کسی شخص کا سماج میں رتبہ متعین ہوتا تھا۔

تعلیم امراء کے بچوں اور عام بچوں کے لئے علیحدہ علیحدہ ہوتی تھی' کیونکہ امراء چاہتے تھے کہ ان کے بچے جنگی امور' اور انتظامی معاملات میں مہارت حاصل کریں' لہٰذا اساتذہ ان کو جنگی و انتظامی امور کی تربیت دیتے تھے' انہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی تھی کہ وہ سائنس یا فلسفہ پڑھیں۔ اس کے برعکس مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں میں مذہبی تعلیم دی جاتی تھی اور یہاں بھی سیکولر علوم کے بارے میں کچھ نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ اس لئے اگر کوئی معمار' آرٹسٹ' یا دست کار بننا چاہتا تھا تو اسے کسی استاد کی خدمت میں شاگرد کے طور پر کام کرنا ہوتا تھا۔ اس طرح معاشرہ کے ہر طبقہ کے لئے تعلیم اس کے سماجی مرتبہ کے مطابق ہوتی تھی' اور یہ معاشرہ کو حکمراں و رعیت میں تقسیم کرتی تھی۔

برصغیر میں اسکولوں کا یہ نظام برطانوی عہد سے شروع ہوا' چونکہ جاگیردار طبقہ برطانوی حکومت کا حامی رہا' اس لئے حکومت کی یہ خواہش تھی کہ اس طبقہ کے بچے اسکول میں تعلیم حاصل کریں' کیونکہ گھروں پر تعلیم نامکمل رہتی ہے' اور بچہ اکیلے پن کے ماحول میں بہت کچھ نہیں سیکھ پاتا ہے' ابتداء میں امراء نے اس کی سخت مخالفت کی اور اپنے بچوں کو

اسکولوں میں بھیجنے پر تیار نہیں ہوئے کیونکہ اس سے ان کا سماجی مرتبہ گھٹ جاتا تھا۔ لیکن برطانوی حکومت چاہتی تھی کہ جاگیردار طبقہ جدید علوم حاصل کرے اور نئے زمانہ کو سمجھے' کیونکہ دوسری صورت میں یہ جاہل ہو جاتے اور اپنی مراعات کی حفاظت نہیں کر پاتے۔ اس لئے انہوں نے ان کے بچوں کے لئے خاص خاص سہولتیں رکھیں۔ مثلاً انہیں اس بات کی اجازت تھی کہ وہ جتنے چاہے ملازم رکھیں۔ انہیں کسی قسم کی جسمانی سزا نہیں دی جائے گی' کیونکہ یہ امراء کے لئے سب سے بڑی بے عزتی تھی کہ استاد ان کے بچوں کو زد و کوب کرے' جو کہ سماجی طور پر ان سے کم تر تھا۔ اگر اسکول میں رہائش ہوتی تھی تو ان کے لئے ضروری نہیں تھا کہ وہ سب بچوں کے ساتھ میس میں کھانا کھائیں' بلکہ انہیں یہ اجازت تھی کہ وہ اپنے باورچی ملازم رکھیں اور اپنا کھانا علیحدہ سے پکوائیں۔

بعد میں بھرت پور کے برطانوی ریذیڈنٹ کرنل والٹر نے یہ مشورہ دیا کہ راجپوتانہ کی ریاستوں کے شہزادوں کے لئے علیحدہ سے ایک اسکول کھولا جائے' کیونکہ صرف اسی صورت میں ہم ایسے طالب علم پیدا کر سکیں گے جو کتابی کیڑا نہ ہوں بلکہ صحیح معنوں میں "انگلش جنٹلمین" ہوں اور کھیلوں' اور دوسری تفریحوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ کیونکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی تربیت اس طرح سے کی جائے کہ یہ ایک طرف اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے کام کریں اور دوسری طرف انگریزی حکومت کے وفادار رہیں۔ اس پالیسی کے تحت ہندوستان میں کئی ایسے اسکول کھولے گئے کہ جو صرف امراء کے بچوں کے لئے تھے اور جہاں عام لوگوں کے بچوں کو داخلہ نہیں ملتا تھا۔

لیکن انگریزوں کی یہ کوشش کہ امراء کے بچے جدید تعلیم حاصل کر کے' جدید علوم و نظریات سے واقف ہو جائیں' اور حکومت کے معاملات میں ان کی مدد کریں یہ ناکام ہوئی کیونکہ امراء کے یہ بچے وہ تعلیم حاصل نہیں کر سکے کہ جو انہیں انتظامی امور کی گتھیوں کو سلجھانے میں اور جدید دور کے تقاضوں کو سمجھنے میں مدد دے سکتی تھی' لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کا متوسط تعلیم یافتہ آگے آیا' اور اس نے امراء کو قومی تحریک کی رہنمائی سے علیحدہ کر کے' خود اس کو سنبھالا' اور برطانوی حکومت سے تعاون کرنے کے بجائے' اس سے آزادی کا مطالبہ کیا۔

مگر آزادی کے بعد ہندوستان میں تو یہ متوسط طبقہ برسراقتدار آیا کہ جس نے ملک کو جمہوری اور سیکولر راستے پر چلایا' مگر پاکستان میں چونکہ آزادی کے بعد متوسط تعلیم یافتہ طبقہ طاقت ور نہیں تھا اس لئے یہاں جاگیرداروں نے راہنمائی سنبھالی اور ملک کو قدامت پرستی اور پس ماندگی کی طرف لے گئے۔

تعلیمی اداروں میں تشدد

ہر معاشرے میں تعلیمی اداروں کی اس لئے اہمیت ہوتی ہے کہ یہ نوجوان نسل کو زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں کے تحت تربیت دیتے ہیں۔ یہ نئے خیالات' نظریات اور افکار کا مرکز ہوتے ہیں کہ جو معاشرہ میں تبدیلی کے جذبہ کو ابھارتے ہیں' اور اس کی تعمیر نو کے لئے مواد فراہم کرتے ہیں۔ اس لئے تعلیمی اداروں میں استاد اور طالب علم علم و فکر اور نئے نظریات کو فروغ دینے والے ہوتے ہیں۔ طالب علم کہ جس کی نگاہیں مستقبل پر ہوتی ہیں وہ بدلتے افکار و خیالات سے متاثر ہوتا ہے اور اس میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ معاشرے کی فرسودگی کو دور کرے' اس کے جمود کو توڑے' اور معاشرہ کو نئی قدروں اور روایات پر تعمیر کرے' اس کی نوجوانی اس میں جذبہ' جوش اور جرات کو پیدا کرتی ہے۔ اور وہ ہرپابندی سے آزاد تصورات کی دنیا کو عملی دنیا بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

تعلیمی اداروں کی اس اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے مطلق العنانی اور آمرانہ حکومتیں اس بات کی کوشش کرتی ہیں کہ ان اداروں کے اس انقلابی کردار کو ختم کر کے انہیں حکومتی روایات و اقدار کے پروپگنڈے کا ذریعہ بنا دیں' اسی لئے فاشٹ اور آمرانہ حکومتوں میں سب سے زیادہ پابندیاں اساتذہ اور طالب علموں پر ہوتی ہیں' اور تعلیمی ادارے جاسوسوں اور مخبروں سے بھر جاتے ہیں کہ جن کی کوشش ہوتی ہے کہ ہر نئے ابھرنے والے خیال کو کچل دیا جائے' ہر اس تقریر و تحری کو دبا دیا جائے جس میں آزادی' حریت' اور تبدیلی کی بات ہو' اس کے لئے اساتذہ کے تقرر طالب علموں کے داخلہ اور خاص طور سے نصاب تعلیم کو ریاست کے ماتحت کر دیا جاتا ہے۔ تعلیمی اداروں پر ان پابندیوں کے نتیجہ میں یہ آمرانہ حکومتیں تو شاید طویل ہو جاتی ہیں' مگر یہ پابندیاں معاشرہ کی تخلیقی صلاحیتوں اور توانائیوں کو کچل کر رکھ دیتی ہیں اور ذہنی طور پر اسے ویران اور بنجر کر دیتی ہیں' اس کی ایک مثال ہم عصر تاریخ میں جرمنی کی ہے کہ جس کی فاشٹ پالیسیوں کی وجہ سے وہاں کے تعلیمی ادارے ویران ہو گئے اور باصلاحیت اساتذہ کی اکثریت جرمنی چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں آباد ہو گئے۔ اور جو رہ گئے وہ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکے' اگر دیکھا جائے تو یہی کچھ تیسری دنیا کے ان ملکوں میں اور خصوصیت سے پاکستان میں ہو رہا ہے۔ کہ اساتذہ اور باصلاحیت افراد اپنی ذہنی و تحقیقی کاوشوں کے لئے ملک چھوڑ کر ایسے معاشروں کو فائدہ پہنچا رہے ہیں کہ جہاں آزادی خیال و اظہار ہے' اور اگر یہی صورت حال رہی تو ہمارے تعلیمی

ادارے ہر قسم کے تخلیقی عمل سے مبرا ہو جائیں گے۔ اور ہم اس قابل نہیں رہیں گے کہ معاشرہ کی فرسودگی کو چیلنج کر سکیں' اور شاید یہی مقصد و منشا ہمارے حکمراں طبقوں کا ہے۔

انگریزوں کے آنے سے پہلے ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں جس قسم کا نصاب رائج تھا اور اس کے نتیجہ میں جو طالب علم تربیت پاتے تھے۔ اس کا معاشرہ کے ابھرتے ہوئے اور بڑھتے ہوئے سماجی مسائل سے کوئی تعلق نہیں تھا' اسی لئے یہ لوگ نہ تو معاشرہ کے زوال کے عمل کو سمجھ سکے' اور نہ نئی تبدیلیوں کی اہمیت سے واقف ہو سکے' فرسودہ مضامین و خیالات کی تعلیم نے انہیں بھی ذہنی طور پر پس ماندہ اور فرسودہ کر دیا۔ ہندوستان کے تعلیمی نظام میں اس وقت تبدیلی آئی جب یہاں انگریزوں کا اقتدار قائم ہوا' اور ان کی امپیریل ضروریات نے انہیں اس بات پر مجبور کیا کہ وہ یہاں کا نظام تعلیم تبدیل کریں' اس کے نتیجہ میں جو تعلیمی ادارے قائم ہوئے اس میں ایک ایسا نصاب تعلیم تھا کہ جو انتظامیہ کے بوجھ کو سنبھال سکے۔ اگرچہ اس میں اس بات کی کوشش کی گئی نئی تعلیم یافتہ نسل میں اپنی کوئی تخلیقی صلاحتیں زیادہ نہ ابھریں' اور وہ صرف انتظامی ضروریات کو پورا کریں' مگر اس کے باوجود جب انگریزی زبان سے یورپی نظریات و افکار سامنے آئے تو اس نے ہندوستانی تعلیم یافتہ طبقوں کے ذہن کو بدل کر رکھ دیا' اور ہیوم' بنیتھم' والٹیر' روسو' کے علاوہ یونانی فلسفیوں کے افکار' اور سماجی علوم کے نئے نظریات نے علم و ادب کی ایک اور نئی دنیا دریافت کی اور اس مغربی تعلیم یافتہ نسل نے آگے چل کر انگریزوں کے خلاف جدوجہد آزادی میں حصہ لیا' یہ اس نصاب تعلیم کا نتیجہ تھا کہ برطانوی عہد کے طالب علموں میں جمہوریت' انسانی حقوق' اور روشن خیالی کے خیالات پیدا ہوئے اور انہوں نے اسی جذبہ سے سرشار اپنی تاریخ اور ثقافت کی جڑیں تلاش کیں۔

برطانوی عہد میں تعلیمی اداروں میں نصاب کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں پر بھی خصوصی توجہ دی گئی اور مختلف کلبوں اور سوسائٹیوں کے ذریعہ بحث و مباحثہ' علم و ادب' موسیقی' ڈرامہ' اور کھیل کود کو فروغ دیا تاکہ طالب علم نصابی و غیر نصابی دونوں طرح سے خود کی تربیت کر سکے۔ تعلیمی اداروں کے تقدس کے پیش نظر برطانوی دور میں پولیس کو اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ وہ ادارے کے سربراہ کی اجازت کے بغیر اس کے چاردیواری میں قدم رکھ سکے یا کسی طالب علم کو گرفتار کر سکے۔ ان تحفظات کی وجہ سے تعلیمی اداروں کا نہ صرف تقدس قائم ہوا۔ بلکہ اس نے اساتذہ اور طالب علموں کو آزادی اور خودمختاری

دی کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔ اسی لئے ان میں اور عوام میں ایک گہرا رشتہ قائم ہوا۔ کیونکہ عوام ان تعلیمی اداروں کو اس لئے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے کہ یہاں وہ لوگ تھے جو نہ صرف مستقبل کے معاشرے کی تعمیر کے ذمہ دار تھے۔ بلکہ جو عوام کے لئے ذہنی و عملی طور پر لڑنے اور جدوجہد کے لئے بھی تیار رہتے تھے۔

پاکستان بننے کے بعد تعلیمی اداروں کا یہ ڈھانچہ اور یہ روایات ساتھ میں آئیں' اس لئے اس ابتدائی دور میں طالب علموں نے جمہوری حقوق کی جدوجہد میں حصہ لیا' اور جب بھی ہمارے حکمرانوں نے سازش اور گٹھ جوڑ کے ذریعہ سیاسی تبدیلیاں کیں۔ اور جمہوری روایات کو کچلا تو انہوں نے اس کے خلاف آواز نکالی۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں طالب علموں کی یہ جدوجہد اس لئے قابل ذکر ہے کہ یہ ملک میں آزادی رائے اور جمہوری حقوق کے لئے کی گئی تھی اور اس لحاظ سے طالب علموں کی سرگرمیاں ہمارے ان حکمرانوں کے لئے ناقابل برداشت تھیں کہ جو عوام کی رائے اور ان کے ووٹ کو بالائے طاق رکھ کر اقتدار میں رہنا چاہتے تھے۔ اسی لئے اس زمانہ ہی میں طالب علموں پر پہلی مرتبہ فائرنگ بھی کی گئی۔ اور انہیں جیلوں میں بھی بھیجا گیا' مگر اس کے باوجود ان کی تحریک کو دبا نہیں سکے۔

لیکن ملکی سیاست کے ساتھ ساتھ تعلیمی اداروں میں اس وقت تبدیلی آئی جب ایوب خان نے مارشل لاء کے ذریعہ حکومت پر قبضہ کر کے اپنی آمریت کو قائم کیا۔ چونکہ ایک آمر کو سب سے زیادہ خطرہ سیاسی مخالفت کا ہوتا ہے اس لئے اس کی پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان تمام راستوں کو بند کر دیا جائے کہ جو سیاسی مخالفت کو پیدا کرنے کی وجہ بن سکتے ہیں۔ اس ضمن میں تعلیمی ادارے بھی آئے۔ اور اس بات کی کوششیں ہوئی کہ ان کے جمہوری کردار کو ختم کر دیا جائے تاکہ یہاں سے نہ تو نئے نظریات پیدا ہوں اور نہ تبدیلی کے خواش مند طالب علم۔

چنانچہ اس سلسلہ میں جو بنیادی باتیں کی گئیں وہ یہ تھیں کہ طالب علموں کو غیر سیاسی بنا دیا جائے۔ تاکہ وہ حکومت کے لئے خطرہ نہیں رہیں۔ چنانچہ اس زمانہ میں اس بحث کا آغاز ہوا کہ "طالب علموں کو سیاست میں حصہ لینا چاہئے کہ نہیں" حکومت کے حامی خوشامدی دانشوروں نے اس پر فوراً فیصلہ دیدیا کہ طالب علموں کے لئے سیاست ایک خطرناک چیز ہے جو ان کی تعلیمی سرگرمیوں میں رکاوٹ بنتی ہے لہٰذا طالب علموں کو صرف اپنے نصاب پر توجہ دینی چاہئے۔ غیر سیاسی بنانے کے اس عمل کے ذریعہ تعلیمی اداروں میں تمام "طالب علم یونین" ختم کر دی گئیں' اور طالب علموں میں انتخاب جو کہ جمہوری

روایات کے لئے فروغ کا باعث تھا۔ وہ ختم کر دیا گیا۔

اس کے بعد نصاب تعلیم کو تبدیل کرنے کا عمل شروع ہوا اور اس بات کی کوشش کی گئی کہ نئی نسل کے ذہنوں میں جمہوری اقدار کے لئے کوئی جذبہ پیدا نہ ہو' بلکہ "ہیرو ورشپ" کا جذبہ پیدا ہو۔ چنانچہ تعلیم کو نظریاتی' حب الوطنی' اور ہیروز کے کارناموں کے تحت بنایا گیا۔ طالب علم یونین کے خاتمہ کے بعد جب تعلیمی اداروں سے غیر نصابی سرگرمیاں ختم ہوئیں تو اس کے ساتھ ہی ان اداروں کی زندگی اور ماحول ویران و بنجر ہو گیا۔ اور طالب علم اور استاد میں صرف کلاس روم کی حد تک رشتہ قائم رہ گیا جو کہ بہت حد تک ایک دوری رکھتا ہے' اور ان کا وہ رشتہ جس میں وہ غیر نصابی سرگرمیوں میں ایک دوسرے سے بے تکلفی سے ملتے تھے وہ ختم ہو گیا' اس نے استاد اور طالب علم کو ایک دوسرے سے دور کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی تعلیمی اداروں سے مباحثوں' موسیقی و ڈرامہ کے مقابلوں' اور دوسری سماجی و ثقافتی سرگرمیوں کا خاتمہ ہوا' جس نے طالب علموں کی زندگی کو تعلیمی اداروں کے ماحول کو غیر دلچسپ بنا دیا۔

ایوب خان کے زمانہ میں تعلیمی اداروں کے تقدس کا اس طرح سے خاتمہ ہوا کہ ان اداروں میں پولیس اپنی مرضی سے داخل ہونے لگی اور طالب علموں اور اساتذہ کی پٹائی بھی کرنے لگی اور انہیں گرفتار کر کے بھی لے جانے لگی۔

تعلیمی اداروں کے ڈھانچہ اور کردار میں اس وجہ سے بھی تبدیلی آئی کہ جب ملک میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگی' اور سیاسی جماعتیں اس قابل نہیں رہیں کہ جلسوں اور جلوسوں کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں تو انہوں نے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے طالب علموں کا سہارا لیا' اور ہر سیاسی جماعت نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ طالب علموں میں اپنی جماعت بنائے اور اس کے ذریعہ تعلیمی اداروں پر قبضہ کر کے خود کی سیاسی اہمیت کو قائم کرے۔ چنانچہ ان سیاسی جماعتوں کی پیدا کردہ طالب علم جماعتوں نے یونین کی جگہ لے لی' مگر چونکہ ان کا مقصد نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کو فروغ دینا نہیں بلکہ اپنی اہمیت کو قائم کرنا تھا' اس لئے انہوں نے اس مقصد کے لئے طاقت و قوت اور تشدد کا ذریعہ استعمال کیا' اور اس نے ان جماعتوں میں تشدد کی فضا کو پیدا کیا' کیونکہ سوائے طاقت کے اور کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ جس کے ذریعہ وہ اہمیت قائم کر سکتے' چنانچہ ان طالب علم جماعتوں میں بھی فاشسٹ اور آمرانہ روایات پیدا ہوئیں جنہوں نے طالب علموں کو جمہوریت' انسانی حقوق اور مظلوموں کی حمایت سے دور کر دیا' چنانچہ ایوب خان کے بعد

سے طالب علموں کا جو کردار سامنے آیا' اس میں کوئی جمہوری تحریک نہیں' انسانی حقوق کے لئے آواز نہیں' بلکہ اب ان کی سرگرمیوں کا دائرہ ان کے اپنے مفادات ہو کر رہ گئے' ان کی تحریک کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں رہا کہ اپنی جماعت کے گرفتار راہنماؤں کو آزاد کرایا جائے۔

اس کا ایک سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ جب طالب علم عوامی جمہوری تحریکوں سے کٹے تو ان کا رشتہ عوام سے ٹوٹ گیا' اور اب تک جو عوام ان کا ساتھ دیتے تھے' اور ان کی حمایت میں ہڑتالیں کرتے تھے اب وہ محبت و احترام کے طور پر نہیں رہا' بلکہ خوف اور ڈر ہونے لگا۔ اس لئے اب عوام میں طالب علموں کے بارے میں یہ تاثر نہیں کہ یہ پڑھنے والے' یا مستقبل کے معمار ہیں۔ بلکہ تاثر یہ ہے کہ طالب علم غنڈے' بدمعاش' دہشت گرد' اور ہنگامہ کرنے والے ہیں' لہٰذا ان سے دور رہا جائے' یہ نتیجہ ہے اس پالیسی کا کہ جو ایوب خاں کے دور میں شروع ہوئی اور اس کے بعد میں آنے والے ہر آمر اور جابر حکومتوں نے اسے اختیار کیا' چونکہ اس وقت بھی حکمراں طبقوں کا مفاد اسی میں ہے کہ تعلیمی اداروں سے روشن خیال اور جمہوری روایات پیدا نہ ہوں اس لئے آج بھی طالب علموں کو غیر سیاسی بنانے' اور تشدد کے ذریعہ ایک دوسرے سے الجھانے کے عمل کی سرپرستی کی جا رہی ہے۔

تعلیمی اداروں سے تشدد کا خاتمہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب ملک میں اور ان اداروں میں جمہوری اقدار کا قیام ہو' اور نصاب کو تبدیل کر کے اسے وقت کے تقاضوں کے مطابق بنایا جائے۔ اور غیر نصابی سرگرمیوں کو پورا پورا فروغ دیا جائے۔

آمریت کو کیسے روکا جائے؟

جن ملکوں میں جمہوری روایات کمزور ہوتی ہیں وہ آسانی سے آمرانہ نظام کے شکنجوں میں جکڑ جاتی ہیں' اور ہوتا یہ ہے کہ جب فوجی انقلاب' یا اس کے اقتدار کے بعد مختلف سیاسی' سماجی جماعتیں' گروپس' کلب اور گروہ ان کی حکومت و اقتدار کو تسلیم کر لیتے ہیں تو اس کے بعد ان کا کوئی مخالف گروپ یا جماعت نہیں رہتی اور ان کے لئے یہ آسان ہو جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو دبا کر رکھیں' ہر تنقید کو کچل کر رکھدیں' اور لوگوں پر آسانی سے حکومت کریں۔

یہ ہر آمر کی روایت ہوتی ہے کہ طاقت میں آنے کے بعد سب سے پہلے وہ ان تمام جمہوری اداروں کو ختم کرتا ہے جن سے اسے خطرہ ہوتا ہے لیکن ان معاشروں میں فوجی انقلاب یا آمریت کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتی کہ جہاں جمہوری ادارے مضبوط ہوں جیسے ٹریڈ یونین یا دوسری سماجی جماعتیں' اور سیاسی پارٹیاں' اس کی مثال ہمیں روسی تاریخ میں ملتی ہے کہ جب ۱۹۱۷ء میں فوجی انقلاب کی کوشش کی گئی' تو ریلوے یونین نے فوج کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے سے انکار کر دیا۔ اور اس وجہ سے فوجی جنرل اپنے اقتدر کو مستحکم کرنے میں ناکام رہا۔

اسی طرح سے اگر نیوزمیڈیا تعاون کرنے سے انکار کر دے' اور ان کے اقتدار میں آنے کی کوئی خبر نہ چھاپے اور نہ نشر کرے تو اس صورت میں ان کی کوشش محدود ہو کر ختم ہو جائے گی۔ اگر بیوروکریسی فوجی حکومت کے اشاروں پر چلنے سے انکار کر دے تو بھی ان کے لئے ناممکن ہو جائے گا کہ وہ حکومت کو چلا سکیں۔

لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہو گا کہ جب ان اداروں میں جمہوری روایات مضبوط ہوں۔ اور انہیں اس بات کا یقین ہو کہ جمہوریت آمریت کے مقابلہ میں زیادہ اچھا نظام حکومت ہے۔ اور یہ ایمان اور یقین اس وقت پیدا ہو کہ جب جمہوری دور میں ان اداروں کے مفادات کا تحفظ کیا جائے اور یہ جمہوری حکومت اور اس کی پالیسیوں سے فائدہ اٹھائیں' تو اس صورت میں یہ جمہوری حکومتوں کا دفاع کریں گے۔

پاکستان کی مختصر سی تاریخ میں یہاں پر نہ صرف مارشل لاء آئے بلکہ بدترین قسم کی فوجی حکومت اور مطلق العنانیت قائم رہی کہ جس نے معاشرہ میں جمہوری عمل کو نہ صرف روک دیا بلکہ اسے پوری طرح سے ختم کرنے کی کوشش کی' اور ان تمام اداروں اور

روایات کو کمزور کر دیا کہ جو جمہوری معاشرہ کے قیام میں مدد دیتیں۔

پاکستان میں کیوں جمہوریت ناکام رہی اور یہاں کیوں آسانی سے فوجی حکومتیں اور آمر آتے رہے؟ اس سوال کا جواب ہماری تاریخ کے اندر ہی چھپا ہوا ہے پاکستان بننے کے فوری بعد مسلم لیگ مضبوط جماعت کی حیثیت سے ابھری اور اس نے اپنی حکومت بنائی' لیکن ساتھ ہی اس نے کوشش کی کہ اس کی حکومت بغیر کسی مخالفت کے ہمیشہ کے لئے قائم رہے اور وہ کسی بھی دوسری جماعت کو اقتدار میں نہ تو شریک کیا جائے' اور نہ اسے موقع دیا جائے کہ وہ اقتدار حاصل کر سکے' اس لئے حزب اختلاف کہ جو جمہوریت کے لئے انتہائی ضروری ہے' اسے ابھرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ اور اپنے خلاف کسی تنقید کو برداشت نہیں کیا گیا۔

ریاست اور حکومت کے دو ادارے جو علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں ان دونوں کو ملا کر ایک کر دیا گیا اور اسی لئے ہر مخالفت کو غداری کے مترادف قرار دیا گیا۔ اگرچہ ان تمام مخالفتوں کے باوجود دوسری سیاسی جماعتیں بنیں مگر ان کا ڈھانچہ بھی سیاسی ہی رہا جیسا کہ مسلم لیگ کا تھا اور ان میں بھی چند لوگوں کی اجارہ داری رہی' اور عام سیاسی کارکنوں کو قطعی اس کا موقع نہیں دیا گیا کہ وہ آواز اٹھا سکیں' یا آگے بڑھ سکیں۔

پاکستان بننے کے بعد مسلم لیگ نے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لئے نوآبادیاتی روایات کو جاری رکھا' اور حکومت کے تمام اداروں کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس میں ایک روایت یہ تھی کہ بیوروکریسی کو اس بات کی اجازت نہیں دی گئی کہ وہ سیاست میں حصہ لے۔ بلکہ اس کے کردار کو اس طرح سے ڈھالا گیا کہ وہ ہر اس حکومت کی وفادار رہے کہ جو قانونی ہو یا غیر قانونی' مگر جس کے پاس اقتدار ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرہ کا تعلیم یافتہ طبقہ' جو بیوروکریسی میں جاتا ہے اسے سیاست میں حصہ لینے کے بنیادی حق سے محروم کر دیا گیا۔

اس طرح یونیورسٹی' کالج اور تعلیمی اداروں کے اساتذہ کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ الیکشن لڑ سکیں یا کسی سیاسی جماعت کے رکن بن سکیں' اسی کو نجی اداروں اور فرموں نے اپنے ہاں رواج دیا۔ چنانچہ وکیل' ڈاکٹر' تاجر' اور جاگیردار طبقے باقی رہ گئے کہ جو سیاست میں حصہ لے سکتے تھے۔ ان میں سے جاگیردار طبقہ کو سیاست میں آنے اور اس پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کا موقع اس لئے ملا کہ اس کے پاس دولت' وقت اور طاقت تینوں چیزیں تھیں' اور سیاست ان کے لئے ایک ایسا پیشہ بن گیا کہ جس کے ذریعہ وہ دولت اور طاقت

دونوں میں اور اضافہ کر سکتے تھے۔ لہٰذا جاگیردارانہ سیاست کی وجہ سے پاکستان کی سیاست میں جمہوری ادارے مزید کمزور ہو گئے۔ ان کی رعونت' دولت کا اظہار اور طاقت نے ایک عام سیاسی کارکن کو ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا کر رکھدیا کہ جس کی اپنی کوئی آواز اور رائے نہیں رہی۔

پاکستان میں جمہوریت اس وجہ سے اور بھی کمزور ہوئی کہ نہ تو یہاں دستور بنانے کی طرف توجہ دی گئی اور نہ ہی عام انتخابات کرائے گئے جس کی وجہ سے لوگوں کو یہ موقع نہیں ملا کہ وہ سیاسی امور میں حصہ لیتے' یہی وجہ تھی کہ لوگ آہستہ آہستہ بے حس اور لاپرواہ ہوتے چلے گئے اور حالات کو خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھنے کے عادی ہو گئے۔

اگر حکومتیں بدلیں بھی تو وہ سازشیوں کے ذریعہ بدلیں' لوگوں کی خواہشات اور مرضی کے مطابق نہیں۔ اور جو بھی نئی حکومت آئی اس کا پہلا کام یہی ہوا کہ کس طرح سے مخالفت کو ختم کیا جائے اور زبردستی لوگوں کو اپنا وفادار بنایا جائے۔ اس کا سب سے بڑا شکار اخبارات رہے' اور انہیں آزادانہ تنقید کرنے کے مواقع نہیں دیئے گئے۔ رہے ٹی۔ وی اور ریڈیو تو وہ حکومت کے ادارے تھے۔ اس لئے وہ حکومت کے لئے پروپیگنڈے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکے۔ اگر کسی جماعت اور گروپ نے مظاہرہ کرنے کی جرات کی تو اسے سختی سے روکدیا گیا اور ضرورت سمجھی گئی تو گولی چلانے سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔

یہ پاکستان کے ابتدائی دنوں میں ہوا کہ جب جمہوری حکومت قائم تھی اور اقتدار ایک سیاسی جماعت کے ہاتھوں میں تھا۔ لیکن اس سیاسی جماعت نے خود اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹا اور جب جمہوری اداروں کو نشوونما پانے اور پنپنے کا موقع نہیں ملا تو ملک میں آمریت کی راہیں ہموار ہو گئیں۔ اور جب ۱۹۵۸ء میں ایوب خان کا مارشل لاء لگا تو ملک میں اس کے خلاف کوئی مزاحمتی تحریک نہیں اٹھی۔ ٹریڈ یونین' طالب علم' تاجر' بیوروکریسی اور دوسری سیاسی و ثقافتی جماعتیں خاموش رہیں۔ عام لوگوں نے مارشل لاء کو اس لئے خوش آمدید کہا کہ جمہوری حکومت انہیں اپنے عمل سے مایوس کر چکی تھی اور ان کی توقعات اس سے پوری نہیں ہوئیں تھیں۔

ایوب خان اور یحییٰ خان کے بعد تھوڑی مدت کے لئے ملک میں جمہوری حکومت قائم رہی' مگر اس میں بھی بھٹو کی ذاتی خواہشات اور جاگیردارانہ ذہنیت کی وجہ سے جمہوری روایات کو مستحکم کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ حزب اختلاف کو برداشت نہیں کیا گیا۔ پریس کی آزادی چھین لی گئی' ریڈیو اور ٹی۔ وی کو لیڈر اور اس کی جماعت کے

پروپگنڈے کے لئے استعمال کیا گیا۔ طالب علموں اور مزدوں کی جماعتوں میں حکومتی پارٹی کے کارکنوں کو داخل کر کے ان کے کام میں رکاوٹیں پیدا کی گئیں اور کوشش کی گئی کہ انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ اسی وجہ سے فوج کو ایک بار پھر موقع ملا کہ جمہوری حکومت کو ختم کرکے اقتدار پر قابض ہو جائے کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس بدعنوان جمہوری حکومت کی حمایت میں کوئی نہیں اٹھے گا۔ اور ہوا بھی یہی۔

ضیاء الحق نے گیارہ سال آرام سے حکومت کی کیونکہ کوئی ایسے جمہوری ادارے باقی نہیں بچے تھے کہ جو اس کی حکومت کی مزاحمت کر سکتے اور جو تھوڑی بہت مزاحمت ہوئی تو اس نے آسانی سے کچل کر رکھ دیا اس نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کی غرض سے رہے سے جمہوری اداروں اور روایات کو ختم کر کے اپنی حمایت کی غرض سے علماء' مشائخ' تاجر' اور جاگیرادر طبقوں کو مراعات دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں صرف فوج ایک ایسا ادارہ رہ گئی کہ جو مستحکم تھا اور اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنی بقاء اور اپنی مراعات کے لئے لوگوں کے سامنے اس کو بڑھا چڑھا کر پیش کرے کہ ملک خطرے میں ہے۔ اور اس کا دفاع صرف فوج کر سکتی ہے۔ اور کوئی ادارہ اس قابل نہیں کہ ملک کی سیاسی و نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کرے۔

اس لئے جب سوال ہوتا ہے کہ ملک کو کس طرح سے فوجی آمریت سے بچایا جائے۔ تو اس کا جواب یہی ہے کہ اگر معاشرہ میں سیاسی جماعتیں 'گروپس' اور پارٹیاں مضبوط نہیں ہوں گی۔ ٹریڈ یونین' اور طالب علم یونین باعمل نہیں ہوں گی' اور پریس آزاد نہیں ہو گا تو اس صورت میں آمریت قائم ہونے کے مواقع بڑھ جائیں گے۔ اور اس کو روکنے کا حل یہی ہے کہ ملک میں ہر سطح پر جمہوری اداروں کو قائم کر کے جمہوری روایات کو فروغ دیا جائے۔

ہماری سیاسی جماعتوں کو ایک بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ جمہوریت میں کبھی بھی کسی ایک سیاسی جماعت کی حکومت ہمیشہ قائم نہیں رہتی ہے' الیکشن جیتنا اور ہارنا بھی ایک جمہوری روایت ہے۔ اس لئے ہر سیاسی جماعت کو الیکشن جیتنے کے ساتھ الیکشن ہارنے اور اس ہار کو تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے۔

وی- آئی- پی اور مراعات

جب کوئی معاشرہ اخلاقی قدروں' اور خوبیوں سے محروم ہو جاتا ہے تو وہ آہستہ آہستہ اس قدر پس ماندہ ہو جاتا ہے اور اس کی تخلیقی صلاحیتیں اس قدر دب جاتی ہیں کہ اس میں کوئی جان نہیں رہتی ہے اور نہ اس میں یہ توانائی اور قوت باقی رہتی ہے کہ وہ دنیا کی تہذیب و تمدن میں کچھ اضافہ کر سکے۔ ایک ایسے معاشرہ میں علم و ادب' دانشوری' ذہانت' فن آرٹ اور ایمانداری کی کوئی قدر باقی نہیں رہتی' اور صرف طاقت و دولت ایسے اوصاف ہوتے ہیں کہ جن کی لوگ قدر کرتے ہیں اور جن کی عزت کی جاتی ہے۔

اور جن افراد کے پاس دولت اور طاقت ہوتی ہے' وہ دانش وری اور علم و ادب کی صلاحیتوں سے محروم ہوتے ہیں اور اس قابل نہیں ہوتے ہیں کہ آرٹ یا ادب میں کچھ بھی اضافہ کر سکیں' یا اس کو سمجھ سکیں۔ ان لوگوں کی ذہنی سطح اس قدر کم ہوتی ہے کہ اگر ان کے پاس سے دولت اور طاقت نہ رہے' تو وہ ایک عام آدمی کی سطح پر آ جائیں' کیونکہ دولت اور طاقت جو انہیں خاندان سے ورثہ میں ملتی ہے نہ تو ان کی ذہنی سطح کو بلند کرتی ہے اور نہ ان میں کوئی صلاحیت پیدا کرتی ہے' اس لئے ان دو چیزوں کے بغیر ان کی حیثیت معاشرہ کے لئے ایک بوجھ ہوتی ہے کیونکہ صرف دولت اور طاقت ان کی کمزوریوں اور بدخصلتوں کو چھپاتی ہے۔ اپنی ذہنی کمتری' اور کھوکھلے پن کو چھپانے کی خاطر یہ لوگ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ادب آداب کی رسومات کے ذریعہ وہ لوگوں سے اپنی عزت کرائیں۔

ہندوستان میں مغلوں کے آخری زمانہ میں بھی جب کہ بادشاہ اپنی سیاسی طاقت کھو بیٹھا تھا اور امراء کے پاس بھی دولت و اقتدار نہیں رہا تھا۔ تو اس کے ساتھ ہی معاشرہ میں ان کا سماجی مقام بھی گر گیا تھا۔ اس لئے انھوں نے لوگوں سے اپنی عزت کرانے کے لئے مراعات اور آداب پر زور دینا شروع کر دیا۔ مغل بادشاہ جو انگریزوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہ گیا تھا' اپنی ظاہری آن بان کو برقرار رکھنے کے لئے اس بات پر اصرار کرتا تھا کہ انگریز ریذیڈنٹ اسے تسلیم کرے اور کورنش بجا لائے' اور برطانوی افسروں کو دربار میں بیٹھنے کی مراعت سے انکار کرتا تھا' لیکن ان مراعات پر اصرار کرنا اس لئے بیکار ثابت ہو کہ اس کے پاس نہ کوئی طاقت تھی' اور نہ اس کی کوئی مضبوط حیثیت تھی' اسی لئے وقت کے ساتھ ساتھ اس کی مراعات گھٹتی رہیں یہاں تک کہ وہ اس مرحلہ پر آگیا کہ جہاں اس کی

ضرورت ہی نہیں رہی۔

مغل امراء کا بھی یہی حال تھا کہ جیسے جیسے ان کی سیاسی اور معاشی حالت بگڑ رہی تھی اسی طرح وہ اپنے سماجی مرتبہ کے سلسلہ میں حساس ہوتے جا رہے تھے' اور ادب و آداب کے معاملہ میں خیال رکھنے لگے تھے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال مرزا غالب کی ہے کہ جنہوں نے کالج میں محض اس لئے ملازمت نہیں کی کہ پرنسپل ان کے استقبال کے لئے کیوں نہیں آیا۔ اس لئے انہوں نے یہ گوارا کر لیا کہ وہ ملازمت نہ کریں' مہاجنوں سے سود پر قرضہ لیتے رہیں' مگر اپنا سماجی مقام کم نہ ہونے دیں۔

انگریزی عہد میں مغل عہد کے امراء' طاقت و دولت کھونے کے بعد اپنے خاندانی فخر پر زندہ تھے' اور اسی بنیاد پر لوگوں سے اپنی عزت کروانا چاہتے تھے۔ اس لئے وہ خاندان اور ذات کے بارے میں کوئی سمجھوتہ کرنے پر تیار نہیں تھے' اور ان سے بعض تو اپنی غربت اور مفلسی کے باوجود نچلے طبقوں سے نفرت کرتے رہے اور ان کے ساتھ میل ملاپ کے لئے تیار نہیں ہوئے۔

مغل بادشاہ اور امراء جس بات کو نہیں سمجھ سکے وہ یہ کہ جب وہ اپنے عوام کو بیرونی اور اندرونی خطرات سے محفوظ نہیں رکھ سکے اور ان کے جان و مال کو نہیں بچا سکے تو اس صورت میں لوگوں میں ان کی کوئی عزت نہیں رہی' اور جب ان کا خاتمہ ہوا تو کسی کو بھی ان کی موت کا افسوس نہیں ہوا۔

یہی کچھ صورت حال پاکستان کے حکمراں طبقہ کی ہے' کہ ان میں نہ تو ذہانت ہے' نہ ایمانداری اور نہ ہی علم و ادب سے ان کا واسطہ ہے' اور نہ ہی ان میں کوئی ہنر و فن ہے' اور اس پر ستم یہ کہ یہ لوگوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کی وہ محض اس لئے عزت کریں کہ ان کا سماجی مرتبہ بدعنوانیوں کے ذریعہ کمائی ہوئی دولت اور طاقت کی وجہ سے بلند ہے۔ یہ خود کو لوگوں سے علیحدہ کرتے ہوئے اپنے لئے وی۔ آئی۔ پی اور وی۔ وی۔ آئی۔ پی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ان کے چہرے مہرے' چال ڈھال' اور ظاہری شکل سے یہ قطعی کوئی جدا مخلوق نظر نہیں آتے' لیکن جب یہ مراعات طلب کرتے ہیں' اور خود کو وی۔ آئی۔ پی ظاہر کرتے ہیں تو اس وقت ان کے سماجی مرتبہ کا پتہ چلتا ہے' اور اس طرح سے یہ اپنے ذہنی کھوکھلے پن اور اس کمتری کو مراعات کے ذریعہ چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے یہ اس بات کا بڑا خیال رکھتے ہیں کہ کون انہیں سلام کرتا ہے' اور کون ان کے آگے جھکتا ہے' یہ ان باتوں پر بھی غصے ہوتے ہیں کہ جب ایئرپورٹ پر سیکورٹی افسران کی

تلاشی لیتا ہے' یا ٹریفک کانسٹیبل ان کو خلاف ورزی پر ٹوکتا ہے۔ ان کے لئے ریلوے' ایئرپورٹ' اور ہسپتالوں میں علیحدہ سے کمرے ہوتے ہیں' کیونکہ ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ ہر جگہ اور ہر ممکن طریقہ سے خود کو عوام سے ممتاز رکھیں۔ ہم نے اس سلسلہ میں تاریخ کا انتقام مغل امراء کے ساتھ دیکھ لیا ہے' اور اس انتظار میں ہیں کہ تاریخ پاکستان کے حکمران طبقوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔

مغل امراء کا خاتمہ اور ہمارے حکمران طبقے

اور نگذیب کی وفات کے بعد ہندوستان میں مغل خاندان کا زوال شروع ہوا' اور آہستہ آہستہ بادشاہ کی ذات جو طاقت و قوت کا سرچشمہ ہوتی تھی' وہ گھٹنا شروع ہوئی' اور امراء کی سیاست میں وہ بالآخر کٹھ پتلی بن کر رہ گیا' اور اس کے ساتھ خود مغل امراء جو اب تک ایک جماعت کی حیثیت تھے' تقسیم ہو کر کئی گروپوں میں بٹ گئے' اور اقتدار میں آنے کے ملئے انہوں نے سازش اور گٹھ جوڑ کا ایک نہ ختم ہونیوالا سلسلہ شروع کر دیا کہ جس میں خانہ جنگی اور تخت نشینی کے جھگڑے شامل تھے۔ ان میں سے جو گروپ بھی برسراقتدار آ جاتا تھا اس کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھی کرے' اور اپنے مخالفوں کو جس قدر نقصان پہنچا سکے وہ پہنچا لے۔

اس پورے عمل میں معاشرہ کی اخلاقی قدریں اور روایات اس طرح سے پروان چڑھیں کہ ظاہری طور پر معاشرہ پرسکون دکھائی دیتا تھا' مگر اس کے اندر ہی اندر تبدیلیاں آ رہیں تھی۔ اس دور کی ایک اہم خصوصیت منافقت تھی۔ کہ امراء کے دو گروہ جو ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے مگر دکھاوے کے طور پر وہ ایک دوسرے سے بڑی خوش اخلاقی سے ملا کرتے تھے۔ دشمن پر صاف طور پر وار کرنے کا رواج نہیں تھا بلکہ اس کے لئے ہمیشہ سازش کی جاتی تھی' اور خفیہ طریقوں سے اسے زک پہنچائی جاتی تھی۔

امراء کے ہر گروپ کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ افراد کی حمایت حاصل کرے' اس لئے ہر امیر اس مدد کے عوض جاگیر حاصل کرنا چاہتا تھا' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے پاس جو خالی جاگیریں تھیں وہ بہت جلد نئے امیروں میں تقسیم ہو گئیں' لیکن امراء کی تعداد برابر بڑھتی رہی' اس لئے یہ کیا گیا کہ خالصہ زمین سے جو بادشاہ کی آمدنی کے لئے مخصوص ہوتی تھی۔ اس میں سے جاگیریں دی گئیں' اس نے بادشاہ کی آمدنی گھٹا دی۔

اس عہد کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ امراء ظاہری شان و شوکت پر بہت زیادہ توجہ دیتے تھے' اس لئے امراء یہ کوشش کرتے تھے کہ اپنے لئے زیادہ سے زیادہ اور شاندار خطابات اختیار کریں' مگر ان خطابات کو رکھنے والے ان کے اوصاف سے خالی ہوتے تھے اس لئے بہت جلد ان خطابات کی اہمیت جاتی رہی' اور یہ بے معنی ہو کر رہ گئے' اور یہی حال منصبوں کا ہوا' کہ جن کی عزت و احترام ختم ہو گیا۔

جب امراء کی سماجی حیثیت آہستہ آہستہ ختم ہو گئی' اور لوگوں میں ان کی عزت نہیں

رہی تو انہوں نے لوگوں سے تعلقات ختم کر لئے اور اپنی حویلیوں میں گوشہ نشین ہو گئے اور یہ اس لئے باہر نہیں آتے تھے کہ ان کے پاس نہ تو ایسا لباس رہا کہ جس کے پہننے کے یہ عادی تھے' نہ سواری ہی' اور نہ ملازموں کی فوج جو ان کے ساتھ ساتھ چلا کرتی تھی۔ کیونکہ انہوں نے ملازمتیں اختیار کرنا اپنے سے کم تر جانا' اس لئے ان کی آمدنی کے ذرائع گھٹتے گئے یہاں تک کہ غربت و مفلسی کے ہاتھوں یہ تباہ حال ہو گئے' ۱۸۵۸ء کا ہنگامہ ان کے لئے موت ثابت ہوا کیونکہ اس کے بعد یہ معاشرہ سے غائب ہو کر عام لوگوں میں مل گئے۔

اسی قسم کی صورت حال سے آج کل ہمارے حکمران طبقے' اور امراء دوچار ہیں کہ یہ کبھی پاکستان کے ذرائع کو لوٹنے میں بری طرح سے مصروف ہیں' اور ہر ایک کی یہ کوشش ہے کہ بدعنوانیوں کے ذریعہ جس قدر دولت اکٹھی کی جا سکے وہ کر لی جائے۔ اور اپنے مخالفوں کو سازشوں کے ذریعہ نقصان پہنچایا جائے۔

دوسری طرف مغل امراء کی جماعتوں کی طرح اب ہر حکومت اس بات کی کوشش کرتی ہے کہ ایم۔ این۔ اے اور ایم۔ پی۔ اے کی حمایت حاصل کرنے کے لئے انہیں پلاٹ دیئے جائیں۔ بنکوں سے قرضے دلوائے جائیں' اور ہر قسم کی مراعات دی جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو رہا کہ ملک میں خالی پلاٹوں اور زمینوں پر تیزی سے قبضہ ہو رہا اور وہ وقت آ گیا ہے کہ جب یہ بالکل ختم ہو جائیں گے۔ یہی حال قرضوں کا ہوا ہے کہ اس کی وجہ سے ملک کے ذرائع گھٹتے چلے جا رہے ہیں۔ ان تمام باتوں کے نتائج ہمارے سامنے ہیں کہ ہندوستان میں مغل بادشاہ و امراء کے ساتھ کیا ہوا؟ مگر سوال یہ ہے کہ تاریخ سے کوئی سبق سیکھے گا یا نہیں۔

سزائے موت

پہلا سین (۱۸ صدی کا فرانس)

فرانس میں ہنری چہارم پر قاتلانہ حملے کے جرم میں ایک شخص ڈامیں کو سزائے موت سنائی گئی۔ جس دن اسے سزا ہوئی تھی اسے ایک کھلی گاڑی میں بٹھا کر شہر کے بڑے چوک میں لایا گیا۔ جہاں سزا کے لئے ایک چبوترہ بنایا گیا تھا۔ سزا کو دیکھنے کے لئے پورا شہر پیرس الڈ آیا تھا۔ عورتیں، بچے، مرد، امیر و غریب، چھوٹے بڑے سب ہی جمع تھے۔ قریب کی عمارتوں کی چھتوں، کھڑکیوں، دروازوں اور دیواروں پر لوگ ہی لوگ جمع تھے۔ کچھ مردوں نے بچوں کو کندھوں پر اٹھا رکھا تھا تاکہ وہ مجرم اور سزا کو آسانی سے دیکھ سکیں۔

قیدی کو برہنہ حالت میں چبوترے پر لایا گیا، اور اس کے ہاتھ پیر باندھ کر اسے چت لٹکا دیا گیا۔ اس کے بعد اس کے جسم کو گرم سلاخوں سے داغنے کا سلسلہ شروع ہوا، کوئلوں سے دہکتی ہوئی سلاخیں جیسے جیسے اس کے جسم سے چپکتی تھیں، قیدی کی چیخیں اذیت و تکلیف سے بلند ہوتیں۔ تھوڑی دیر میں جلے ہوئی گوشت کی بو فضا میں پھیل گئی۔ جب سزا پوری ہو گئی تو قیدی کے چاروں ہاتھوں و پیروں کو رسیوں سے باندھ کر چبوترے سے نیچے کھڑی گھوڑا گاڑیوں سے باندھ دیا گیا، اور گاڑی بانوں نے گھوڑوں کو چابک مارے تاکہ گاڑیوں مختلف سمتوں میں جائیں اس طرح قیدی کے ہاتھ و پیر اس کے جسم سے علیحدہ ہو جائیں۔ پہلی کوشش ہوئی مگر اس میں کامیابی نہیں ہو سکی اور قیدی کے ہاتھوں و پیروں نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس کے بعد دوسری مرتبہ پھر کوشش ہوئی اس مرتبہ ایک گاڑی قید کا ہاتھ لے کر بھاگی اور مجمع نے اس کامیابی پر زور دار تالیاں بجائیں۔ جب دوسروں کو کامیابی نہیں ہوئی تو ایک جراح بلایا گیا تاکہ بقیہ ہاتھ پیر کاٹ کر سزا پر عمل کرایا جائے۔ جب جراحوں نے ہاتھ پیر کاٹ ڈالے اور گھوڑے گاڑیاں انہیں لے کر مختلف سمتوں میں چلی گئیں، تو قیدی نے سر اٹھا کر اپنے جسم کو دیکھا، اور اس کے ساتھ ہی خاموشی سے اس کا سر ڈھلک گیا۔

دوسرا سین (اٹھارویں صدی کا ہندوستان)

غلام قادر روحیلہ جس نے شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکالیں تھیں، جب مراہٹوں کے ہاتھوں قید ہوا تو اسے شاہ عالم کے حکم پر سزائے موت سنائی گئی۔ پہلے دن اس کے کان

کاٹ کر اس کی گردن میں ڈالدیے گئے اور اس کا چہرہ کالا کر کے اسے شہر میں گھمایا گیا۔ دوسرے دن اس کی ناک کاٹی گئی اور اس حالت میں اس کی تشہیر کی گئی۔ تیسرے دن اس کی آنکھیں نکالی گئیں اور اسے ایک گاڑی میں بٹھا کر شہر میں پھرایا گیا۔ آخر میں اس کے ہاتھ کاٹے۔ اور پھر سر، اس کے بعد اس کے جسم کو ایک درخت سے الٹا لٹکایا گیا۔ اور اس کی آنکھیں، کان اور ناک صندوقچوں میں رکھ کر شاہ عالم ثانی کو بھیجے گئے۔

عہد وسطی میں موت کی سزا کے پس منظر میں جو نظریات تھے وہ یہ کہ مجرم کو جسمانی اذیت ضرور دینی چاہئے تاکہ اس میں اور عام لوگوں میں فرق ہو سکے۔ اس لئے جسمانی اذیت کو انصاف کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ اور اذیت کے ذریعہ جسم پر جرم کو ثابت کیا جاتا تھا۔ اس مقصد کے لئے ہاتھ، پیر، زبان، اور کان کاٹنا، جسم کو پہیہ سے باندھ کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کرنا، ننگے جسم کو داغنا، اور کوڑے مارنا، مرنے کے بعد جسم کو لٹکانا یا اسے جلا دینا عام طریقے تھے۔

بادشاہت کے زمانے میں مجرم کا جسم بادشاہ کی ملکیت تصور کیا جاتا تھا۔ اس لئے یہ اس کا حق ہوتا تھا کہ وہ اسے سزا دے۔ غلامی اور جاگیرداروں کے زمانہ میں جسمانی اذیت اس لئے بھی دی جاتی تھی کہ ان ادوار کے پیداواری نظام میں محنت اور جسم کی قدر نہیں تھی۔ جسم کی قدر صنعتی دور میں آئی۔ اور اس دور میں محنت معاشرہ کے لئے روزی ٹھہری۔

یہ بھی دستور تھا کہ پھانسی سے پہلے مجرم سے جرم کا اعتراف کرا لیا جائے تاکہ اس طرح اسے دی جانے والی سزا صحیح ہو جائے اور موت کے فیصلہ کو درست تسلیم کر لیا جائے۔ پھانسی سے پہلے مجرم سے کہا جاتا تھا کہ وہ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگے اور خود کو پاک کرے۔

جیسے جیسے یورپ زمانہ جاگیرداری سے نکلتا گیا۔ اور صنعتی دور میں داخل ہوتا گیا وہاں کے معاشرے میں جسمانی اذیت کم ہوتی چلی گئی۔ مثلاً پبلک مقامات پر پھانسی کا رواج ختم ہوا۔ اوراب سزا خاموشی سے جیل میں دی جانے لگی۔ ساتھ ہی میں یہ بھی سوچا گیا کہ مجرم کو اذیت دیئے بغیر کس طرح سے موت کی سزا دی جائے۔ فرانسیسی انقلاب کے دوران گلوٹین کی دریافت اسی سوچ کا نتیجہ ہے۔ بجلی کی کرسی اور زہر کے انجکشن بھی اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

دنیا میں آج موت کی سزا کے خلاف جو رد عمل ہے وہ اس تجربہ کی بنا پر ہے کہ موت کی سزا سے معاشرہ تبدیل نہیں ہو جاتا ہے۔ یہ ضرور ہوتا ہے کہ ایک فرد ختم ہو جاتا ہے

مگر جرائم کی وجوہات باقی رہتی ہیں۔ اور جرم سے نفرت نہیں ہوتی۔

پاکستان میں سزائے موت کے بارے میں اب تک عہد وسطی کے نظریات موجود ہیں کیونکہ ہمارے ہاں قبائل اور جاگیردارانہ قدروں کی وجہ سے بدلہ اور انتقام سزائے موت کو جائز قرار دیتا ہے' دوسری جانب ہماری حکومت جرائم کو مٹانے کی بجائے مجرموں کو مٹانا چاہتی ہے۔ کیا سزائے موت کے ذریعے جرائم کا خاتمہ ممکن ہے؟ تاریخ اس کا جواب نفی میں دیتی ہے۔ کیونکہ ایسا معاشرہ کہ جہاں سماجی انصاف نہ ہو' وہاں انتہائی سخت سزاؤں کے باوجود جرائم باقی رہیں گے۔ جرائم کے خاتمہ کے لئے سماجی انصاف کی ضرورت ہے' ورنہ محض سزائے موت معاشرہ کو اور زیادہ بربریت اور تشدد کی جانب لے جاتی ہے۔

جرمن اور احساس جرم

دوسری جنگ عظیم میں شکست اور اس کی ذلت کے بعد جرمنوں کو جس اذیت سے گزرنا پڑ رہا ہے وہ ان کا احساس جرم ہے۔ جنگ کے فوراً بعد نازیوں کے مظالم کے واقعات دنیا کے سامنے آئے' اس پر مغربی ملکوں اور یہودیوں کا پروپگنڈہ ان سب نے مل کر پوری قوم کی نفسیات پر اثر ڈالا اور وہ احساس جرم کے بوجھ تلے بری طرح سے دب کر رہ گئے۔

چونکہ جنگ کے دوارن اور جنگ کے بعد جرمنی کے خلاف یورپی اقوام میں زبردست مخالفانہ جذبات پائے جاتے تھے۔ اسی لئے جرمن دانشوروں اور سیاستدانوں نے کھلے دل کے ساتھ ان تمام جرائم اور زیادتیوں کا اعتراف کیا کہ جو نازی دور حکومت میں ہوئی تھیں۔ جرمنی کے صدر پروفیسر تھیوڈور ہوئس نے جرمنوں کو مشورہ دیا کہ وہ ماضی کو فراموش نہیں کریں اور جو کچھ ہوا ہے اسے اپنے ذہنوں سے نہیں نکالیں' بلکہ اپنے بعد اسے آنیوالی نسلوں میں منتقل کریں۔ احساس جرم کے جذبات کا اظہار مشہور صحافی اور اشپیگل کے ایڈیٹر روڈولف آگسٹائن کے ان الفاظ سے بھی ہوتا ہے "میں اس کو ایک مقدس فرض سمجھتا ہوں کہ ہم ان تمام ڈراؤنے اور دہشت ناک واقعات کو اپنے سامنے رکھیں کہ جن میں پچاس سال سے جرمنی اپنے ہمسائیوں کے ساتھ ملوث تھا"

جنگ کے فوراً بعد جرمنی کے مشہور فلسفی کارل جیسپر نے ہائڈل برگ یونیورسٹی میں "جرم کے سوال" پر ایک لیکچر دیا' اور اس میں اس نے ان عوامل کا تجزیہ کیا کہ جن کی وجہ سے ہٹلر اقتدار میں آیا اور یہ کہ اس کے ابتدائی دور میں یورپی سرمایہ داروں نے اس کی حمایت کی' اس وقت سیاستداں بھی اس کے لئے ہمدردی اور احترام کے جذبات رکھتے تھے۔ مثلاً ۱۹۳۸ء میں چرچل نے ٹائمز میں ہٹلر کے بارے میں ایک کھلا خط لکھا جس میں ہٹلر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ: اگر انگلستان پر بھی ایسی ہی تباہی آئی ہوتی جیسے جرمنی میں آئی تو میں خدا سے دعا کرتا کہ وہ تمہارے جیسے عزم و حوصلہ کا شخص ہمیں عطا کرے۔ جیسپر نے اپنے اس لیکچر میں یہ دلیل دی ہے کہ جنگ میں جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری چند افراد پر ہے اور اس کے لئے پوری قوم کو مجرم ٹھہرانا درست نہیں ہے۔

اس احساس جرم کی وجہ سے جرمنوں نے اپنے فوری ماضی کو فراموش کرنا چاہا اور کوشش کی کہ اسے اپنی تاریخ سے نکال دیا جائے۔ اس لئے جرمنی کے تعلیمی اداروں میں

تاریخ کو انیسویں صدی تک پڑھایا جانے لگا۔ اور اس کے بعد کے واقعات کو نظر انداز کر دیا گیا۔

لیکن احساس جرم کے سلسلہ میں اتحادی طاقتوں اور جرمنوں کے رجحانات مختلف تھے۔ اتحادی جرمنوں کے ماضی سے خوفزدہ تھے اور یہ ان کے مفاد میں تھا کہ وہ جرمنوں کو اخلاقی طور پر دبا کر رکھیں' اور اس کے لئے انہوں نے نازی دور کو زندہ رکھنا چاہا تاکہ اس کے ذریعہ وہ جرمنوں کے عزائم کو کنٹرول کر سکیں۔ اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہے کیونکہ جرمنوں نے معذرت کا رویہ اختیار کرتے ہوئے خود کا دفاع کیا۔ اور اپنے نقطہ نظر کو تسلیم کروانے میں ناکام رہے۔ بلکہ جرمن دانشوروں اور سیاستدانوں نے خلوص کے ساتھ نازیوں کے جرائم کو تسلیم کیا اور ان کی مذمت کی۔ اور کہا کہ ان جرائم کی شدت کو کم کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم ان جرائم کی خفیہ طور پر حمایت کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی مخالفت کرنی چاہئے۔

خاص بات یہ ہے کہ روس کے سلسلہ میں اتحادیوں کا رویہ جاپانیوں کے ساتھ بالکل دوسرا تھا اس کو جنگی جرائم کے سلسلہ میں مورد الزام نہیں ٹھہرایا گیا اسی لئے اس نے بہت جلد خود کو دوسری جنگ کے ماضی سے چھٹکارا دلایا۔ ایک کورین دانشور ہوچوئے نے جاپان اور جرمنی کا تقابل کرتے ہوئے اس پر روشنی ڈالی ہے کہ آخر کیوں جاپان کو جرائم سے بری کر دیا گیا۔ اس کا خیال ہے کہ ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹم بموں کی تباہی نے جاپان کو ظالم سے مظلوم کا درجہ دیدیا اور وہ اس کی وجہ سے امن کا علم بردار بن کر دنیا کے سامنے آیا۔ اور ہیروشیما کی جذباتیت نے جاپانیوں کے جرائم کو چھپا دیا۔ لیکن ایک فرق اور بھی تھا' جاپانیوں نے جن پر ظلم کئے تھے وہ غیر سفید اقوام سے تعلق رکھتے تھے' جن کی آواز کمزور ہے' جبکہ جرمنوں کے مظالم یورپین اقوام اور یہودیوں پر ہوئے کہ جنہوں نے اپنے خلاف ہونے والے مظالم کو خوب اچھالا' یہاں تک کہ پرل ہاربر کا معمولی واقعہ امریکی تاریخ کا ایک اہم واقعہ بن گیا۔

ہوچو نے جاپان کے بارے میں لکھتے ہوئے کہا ہے کہ جہاں تک لوگوں کے قتل عام کا تعلق ہے تو ہیروشیما اور ناگاساکی میں ایٹم بموں کی وجہ سے مرنیوالوں سے زیادہ تعداد ان جرمنوں کی ہے جو بمباری کی صورت میں مرے۔ مثلاً صرف ڈر۔سڈن میں ۳۰ ہزار مارے گئے۔ اس لئے جاپان اور جرمنی کے سلسلے میں جو فرق رکھا گیا اس کے دو مقاصد تھے: ایک تو یہ کہ اس طرح سے اتحادی چاہتے تھے کہ جرمنی دوبارہ سے فوجی طاقت نہیں بن جائے۔

دوسرا اسرائیلیوں اور اس کے حامی صیہونیوں کا تھا کہ نازیوں کے مظالم کو بیان کر کے اسرائیل کے قیام کا جواز پیش کیا جائے۔ اور پھر اسرائیل میں فلسطینیوں پر جو مظالم ہو رہے ہیں ان کی پردہ پوشی کی جائے۔ نازیوں کے ہاتھوں کا شکار ہونے کے بعد اسرائیلی خود کو مظلوم سمجھنے لگے اور اب وہ فلسطینیوں کے ساتھ جس بربریت کا سلوک کر رہے ہیں وہ ان کی بقاء کی جنگ ہو جائے گی۔ لہٰذا اس وقت اسرائیل کی یہ پالیسی ہے کہ وہ جس قدر فلسطینیوں کا قتل عام کرتے ہیں اس قدر وہ نازیوں کے مظالم کو سامنے لاتے ہیں تاکہ ان کے جرائم پر پردہ پڑ جائے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جو واقعات ہوئے ان کی وجہ سے جرم کا سوال بالکل ایک دوسری صورت سے سامنے آیا' اور یہ چیز واضح ہو کر آگئی کہ جرم کا مسئلہ اس لئے نہیں اٹھایا گیا تھا کہ مستقبل میں جنگ کو روکا جا سکے بلکہ اس کا مقصد صرف جرمنی کی مذمت تھا۔ جب امریکی ویت نام کی جنگ میں ملوث ہوئے اور انہوں نے ویت نام کے خلاف اقدامات کرتے ہوئے ان پر وحشیانہ مظالم کئے۔ تو اس نے اتحادیوں کی منافقانہ پالیسی کو دنیا کے سامنے آشکار کر دیا۔ امریکی عوام نے ان جنگی جرائم کی مذمت کرنے کے بجائے ان کی تعریف کی اور انہیں جائز قرار دیا۔ مائی لائی کے قاتل کو جس نے گاؤں کے معصوم لوگوں کا قتل عام کیا وہ امریکہ میں ایک بہادر ہیرو بن کر ابھرا کہ جس کی تعریف میں گانے گائے گئے۔

دوسری طرف اسرائیل کی ریاست کے تشدد اور بربریت نے جو اس نے فلسطینیوں کے ساتھ کیا ہے اس نے تمام اخلاقی قدروں کو بری طرح سے پامال کر دیا۔ اسرائیلی لیڈر بار بار اس عزائم کا اظہار کر رہے ہیں کہ وہ فلسطینیوں کو کچل کر رکھدیں گے۔ ۱۹۸۹ء میں محکمہ دفاع کے وزیر نے واضح الفاظ میں کہا کہ "فلسطینیوں کو ختم کر دیا جائے گا انہیں مار دیا جائے گا یا ان کو ایسا بنا دیا جائے گا کہ وہ انسانی معاشرہ کے قابل نہ رہیں' اور وہ عرب دنیا کی سب سے زیادہ مفلس اور ذلیل قوم بن جائیں" اور تھوڑا عرصہ ہوا کہ شامیر نے (۱۹۹۱) اعلان کیا کہ "اسرائیل کی ریاست پھیل رہی ہے' اس کی آبادی برابر بڑھ رہی ہے' اس لئے بہادر' وفادار' اور پر عزم یہودی اسرائیل کا ایک ٹکڑا بھی کسی کے حوالہ نہیں کریں گے" صیہونیوں میں فلسطینیوں کے قتل عام کے نتیجہ میں کسی بھی جرم کا احساس نہیں' بلکہ اس کا اخلاقی جواز ضرور ہے۔ اس لئے جب کبھی بھی ان کے جرائم کے بارے میں آوازیں اٹھتی ہیں' تو وہ نازیوں کے عہد کے کیمپ اور یہودیوں پر مظالم کی داستانیں بیان کر کے

لوگوں کو خاموش کر دیتے ہیں۔

جرمنوں کا مسئلہ یہ ہے کہ نازیوں نے یہودیوں پر جو مظالم کئے تھے وہ اس کے بوجھ تلے اس قدر دبے ہوئے ہیں کہ ان میں قطعی یہ ہمت نہیں ہے کہ وہ اسرائیلی جرائم کے بارے میں بول سکیں؛ جب کہ درحقیقت اسرائیلیوں کے مظالم نازیوں سے زیادہ بھیانک اور اذیت ناک ہیں۔

بدلتے ہوئے حالات کے تحت اب جرمنی کے مورخوں میں یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ کس طرح سے جرم کے احساس سے نجات پائی جائے اور اپنے نازی دور کو کس طرح سے تاریخ کا حصہ بنایا جائے۔ چنانچہ جرمنی کے مختلف مورخوں نے نازی عہد کو کئی نقطہ نظر سے لکھا ہے۔

رجعت پسند مورخوں نے نازی ازم کی تحریک کو اسی طرح سے بیان کیا ہے کہ یہ جرمنی میں صنعتی ترقی کی وجہ سے ہوا۔ اس میں متوسط طبقہ کو جاگیردارانہ مراعات دیدی گئیں جب کہ پرولتاری طبقہ کو بالکل محروم کر دیا گیا۔ حکمراں طبقوں نے نچلے متوسط طبقہ کے لوگوں کو جمہوری تحریکوں کے خلاف استعمال کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیشنل سوشل ازم کو مقبولیت مل گئی۔ دیکھا جائے تو جرمن معاشرہ میں نازی ازم کی کوئی جڑیں نہیں تھیں یہ اس لئے پھیلا کہ اسے ہٹلر جیسا راہنما مل گیا' اور ہٹلر نے اسٹالن کی پیروی کی اسے لئے اب جرمنی کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوبارہ سے عیسائی اخلاقیات اور پروشیا کی خوبیوں کو واپس لائے۔

لبرل مورخوں نے پروشیا کے فوجی ورثہ کی مذمت کی کہ جس کی وجہ سے جرمن معاشرہ میں آمریت پروان چڑھی اور یہ دلیل دی کہ جمہوری روایات اور معاشرہ میں سماجی آزادی وہ راستے ہیں کہ جو نازی ازم اور فاشزم کی راہوں کو روک سکتے ہیں۔

۱۹۸۶ء میں ایک کانفرنس میں جس موضوع پر مورخوں نے مقالات پڑھے اس کا عنوان تھا کہ "جرمن تاریخ کس کی ہے؟" اس کانفرنس میں اس پر بحث کی گئی کہ جرمن معاشرہ میں تمام تبدیلیوں کے باوجود نازی ازم کے سائے اس پر پڑ رہے ہیں' اور اسی وجہ سے وہ اپنے اہم مسائل پر پوری توجہ نہیں دے رہے اور ان کے آگے بڑھنے میں رکاوٹیں پیدا ہو رہی ہیں۔ اس لئے وہ وقت آگیا ہے کہ نازی دور کے ماضی کو دوبارہ سے دیکھا جائے اور اس کی تعبیر کی جائے۔ ارنسٹ نولٹے جو کہ ایک قدامت پسند مورخ ہے اس نے نازی ازم کے بارے میں اپنی تحقیقات میں جواز فراہم کیا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نازی ازم

کیمونزم کے نتیجہ میں پیدا ہوا۔ ہٹلر نے اسٹالن کی پیروی کرتے ہوئے کیمپ قائم کئے اور اس میں لوگوں سے بیگار کام لیا۔ اس کا نسلی قتل عام کیمونسٹوں کی طبقاتی قتل عام کے نمونہ پر تھا۔ دونوں نے صنعتی ترقی کے نتیجہ میں ہونے والے مسائل کا حل یہ نکالا کہ لوگوں کے ایک طبقہ کو ختم کر دیا جائے۔ نازیوں نے یورپ کو کیمونزم سے بچایااور اس کے دفاع میں انہیں کسی ایک نظریہ کی ضرورت تھی جو انہیں یہودیوں کی مخالفت میں ملا۔ نازیوں کا یہودیوں کے سلسلہ میں فائنل سولوشن (Final Solution) کیمونسٹوں کے گلاگ کے مترادف تھا۔ نازیوں اور کیمونسٹوں کے نعرے ایک جیسے تھے' دونوں نے پرولتاریوں پر بھروسہ کیا اور بورژوا طبقہ کو اپنا دشمن سمجھا۔ دیکھا جائے تو ہٹلر یہودیوں کے خلاف اس وقت ہوا جب ۱۹۳۹ء میں وائزمن نے یہ اعلان کر دیا کہ دنیا بھر کے یہودی جرمنی کے خلاف برطانیہ کا ساتھ دیں گے۔ قتل عام کے واقعات دنیا کی تاریخ میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اور اس لئے ان میں کوئی تعجب کی بات نہیں ' یہ ان ہونے واقعات نہیں تھے۔ اس کی دلیل ہے کہ جرمنی کی تاریخ اس لئے مسخ ہوئی ہے کیونکہ اس کو فاتحین کے نقطہ نظر سے لکھا گیا ہے۔

ایک دوسرے جرمن مورخ ہل گروبر نے اس بات کی جانب اشارہ کیا کہ نازی مظالم کو بیان کرتے ہوئے آخر کیوں روسیوں کے ان مظالم کو بیان نہیں کیا جاتا کہ جو انہوں نے جنگ کے بعد جرمن لوگوں پر کئے۔ جن میں قتل عام' عورتوں کی عصمت دری اور زبردستی لوگوں کو دوسری جگہ منتقل کرنا تھا۔ جہاں تک جرمن فوج کا تعلق ہے تو وہ جرمن روایات کے مطابق لڑی۔ حب الوطنی اور احساس فرض اس میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ اور اس کی شہادت برطانوی مورخ لڈل ہارٹ نے بھی دی ہے کہ جرمن فوج نے جنگی قوانین کی پابندی ۱۹۱۴ء کی جنگ کے مقابلہ میں زیادہ کی۔ جب جنگ ہو رہی تھی کہ محاذ پر جرمن فوج کواس کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا کہ یہودیوں کا قتل عام ہوا ہے کیونکہ یہ تفصیلات تو جنگ کے بعد ظاہر ہوئیں۔ اس نے یہ دلیل دی ہے کہ یہودیوں کے قتل عام کی ذمہ داری ہٹلر پر ہے کیونکہ جرمن عوام اس سے قطعی بے خبر تھے۔

مائیکل اسٹرمر نے اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ احساس جرم کس طرح سے جرمن قوم کی شناخت میں رکاوٹ بن گیا ہے' اس لئے اس کا کہنا ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ جب جرمن تاریخ کو کوئی مفہوم دیا جائے کہ جس کی بنیاد پر جرمن لوگ قومیت کو پیدا کر سکیں۔ اس نے یہ دلیل دی ہے کہ جرمن لوگ اس طرح سے نہیں رہ سکتے کہ ان کا ماضی

مسلسل انہیں احساس جرم میں مبتلا رکھے۔ اس کی دلیل کے مطابق وائمر جمہوریت اس لئے ناکام ہوئی کہ وہ ورسائی کے معاہدہ کے تحت جس جرم کے بوجھ میں مبتلا تھی اسے برداشت نہیں کر سکی۔ لہٰذا کوشش کرنی چاہئے کہ تاریخ خود کو نہیں دہرائے۔

لیکن یہ بھی درست ہے کہ جرمن لوگ جس احساس جرم میں مبتلا ہیں اس کے کچھ مثبت اثرات بھی ہیں' انہیں جب جنگ کے نتیجہ میں ہونے والے مظالم اور تباہیوں کا احساس ہوا تو اس نے انہیں امن کی طرف راغب کیا اور جرمن معاشرہ زیادہ سے زیادہ امن پسند ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ جرمن لوگ جنگ کی مذمت کرتے ہیں اسلحہ کی تخفیف کے حامی ہیں اور انسانی حقوق کے لئے جدو جہد کرتے ہیں۔ چونکہ انہوں نے فاشزم اور آمرانہ حکومتوں کو دیکھا ہے اس لئے اب وہ دنیا بھر میں جمہوری تحریکوں کی حمایت کرتے ہیں۔

اگر احساس جرم کے یہ مثبت اثرات ہوتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ اسے صرف جرمنی تک کیوں محدود رکھا جائے' اسکو کیوں نہ اہل برطانیہ' فرانس' امریکہ' جاپان اور اسرائیل تک پھیلایا جائے؟

نازی دور: تجربہ سے سیکھنا

دوسری جنگ عظیم کے بعد جرمنی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور یہ دونوں ریاستیں علیحدہ علیحدہ' سیاسی' سماجی اور معاشی تجربات سے گزریں کہ جس کی وجہ سے ان دونوں کی ساخت علیحدہ بنیادوں پر ہوئی جب نازی دور کے بارے میں سوالات پیدا ہوئے تو مشرقی جرمنی کے مورخوں نے مارکسی و لینینی نقطہ نظر کو اختیار کرتے ہوئے فاشٹ دور کی تشریح کی اور اس تھیوری کو بنیاد بنایا کہ جسے ۱۹۳۰ء میں کومنٹرن نے اختیار کیا تھا۔ اس نظریہ کے تحت جب سرمایہ داری نظام کمزوری کے مرحلہ میں ہوتا ہے تو اس وقت وہ رجعت پسند قوموں کے ساتھ مل کر مزدوروں کے ساتھ اتحاد کر لیتا ہے اور حب الوطنی کا نعرہ لگا کر انقلاب کے عمل کو روکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے نازی دور پر تنقید کی اور خود کو اس سے بالکل علیحدہ کر لیا۔ کیونکہ کیونسٹ ہونے کے ناطے وہ نازی پارٹی کے ابتداء سے خلاف تھے اور اس کے نتیجہ میں انہوں نے نقصانات بھی اٹھائے تھے۔

اس لئے نازی دور کی سازی ذمہ داری مغربی جرمنی کے لوگوں پر آئی اور اس کے مورخوں کا یہ کام ٹھہرا کہ وہ اس عہد کی تشریح کریں اور ان پر جو جرائم کا بوجھ ہے اس کسی طرح کم کریں۔ ان مورخوں نے نہ صرف مارکسی نقطہ نظر کو اختیار کیا بلکہ اس کے علاوہ دوسرے غیر مارکسی تاریخی نظریات کو بھی استعمال کرتے ہوئے اس دور کی تعبیر کی۔ اس میں سے ایک "روز مرہ کی تاریخ" ہے کہ جس میں لوگوں سے انٹرویو لے کر نازی دور کے بارے میں لوگوں کے تاثرات کو قلم بند کیا گیا۔ اس میں سے ایک اہم کوشش یہ تھی کہ نازی دور کو پہلے تاریخ کا ایک حصہ بنایا جائے اور پھر اس کے بعد اس کا تجزیہ کیا جائے۔

جرمن مورخوں کے لئے ایک مسئلہ یہ ہے کہ وہ جب بھی نازی دور پر لکھتے ہیں پورا یورپ اور امریکہ ان کی تحریروں کی جانب توجہ دیتا ہے۔ خاص طور سے اسرائیل کہ ان سب کو یہ فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ اس عہد کا مثبت تجزیہ کر کے کہیں جرمن قوم خود کو احساس جرم سے آزاد نہ کرا لے۔

مثلاً جب جرمن مورخوں نے نازی دور کو جرمن تاریخ کا ایک حصہ بنایا تو اس پر اسرائیلی مورخوں نے سخت تنقید کی کیونکہ ان کے نزدیک یہ دور نارمل تاریخی دور نہیں تھا جبکہ ایک ایسا دور تھا جو نارمل حدود سے بڑھا ہوا تھا۔ اس موقع پر وہ مورخ بھی کہ جن کا

یہ کہنا ہے کہ تاریخی واقعات پر کوئی فیصلہ نہیں دینا چاہئے ان کا اصرار تھا کہ نازی دور کی اخلاقی طور پر مذمت کرنی چاہئے۔

ان حالات میں جرمن مورخوں کا کام مشکل ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے جن مختلف نقطہائے نظر سے سارے دور کو دیکھا ہے۔ وہ اس عہد کو سمجھنے کے لئے اہم ہے۔ پہلا سوال تو اس سلسلہ میں یہ تھا کہ نازی دور کو کیا کہا جائے؟ کیا یہ جرمن تاریخ میں ایک حادثہ تھا۔ یا تاریخی عمل کی پیداوار؟ یورپی اور امریکی مورخوں کا کہنا تھا کہ یہ جرمن تاریخ کے سیاسی و سماجی عمل کے نتیجہ میں پیدا ہوا۔ کیونکہ جس جوش و خروش کے ساتھ جرمن قوم نے نازی پارٹی اور اس کے نظریہ کو اختیار کیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان میں نسلی برتری اور دنیا پر حکومت کرنے کے جراثیم موجود تھے۔

اس کے برعکس جرمن مورخوں نے اسے تاریخ میں ایک حادثہ قرار دیا۔ فرٹزفشر نے ۱۹۶۰ء کی دہائی میں اس موضوع پر لکھتے ہوئے کہا کہ جرمن تاریخ کا صحت مند تاریخی عمل پہلی جنگ عظیم کے وقت ٹوٹ گیا جب کے جرمن حکمران طبقوں نے اپنے سامراجی مقاصد کے لئے لوگوں کے جذبات بھڑکائے' بعد میں اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نازیوں نے لوگوں کے جذبات سے فائدہ اٹھایا' اور مقبولیت حاصل کی' اس نقطہ نظر نے جرمن مورخوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور یہ فشر کے نظریہ کے حامی یا مخالف کہلائے۔

کچھ مورخوں نے اس سے بھی اختلاف کیا کہ نازی دور کو فاشزم کہا جائے کیونکہ ان کے نقطہ نظر کے مطابق فاشزم اٹلی کی پیداوار تھا' اور یہ جرمن تجربہ سے بالکل مختلف تھا اس کے برعکس نازی ازم نسلی برتری کا حامی تھا اور ریاست و لوگوں پر اس کو پورا پورا قابو تھا۔ اس کے علاوہ اس کے عزائم میں یہ شامل تھا کہ دنیا کو فتح کیا جائے اور اسے نسلی بنیادوں پر تشکیل دیا جائے۔

جب کہ اٹلی میں فاشزم کے حامی طبقہ اعلیٰ کے لوگ تھے اور ان کا ریاست یا لوگوں پر زیادہ کنٹرول نہیں تھا' اس لئے نازی ازم اور فاشزم کو ایک سمجھنا غلطی ہے' نازی ازم علیحدہ تھیوری تھی جس میں ہٹلر کی سحرانگیز قیادت میں جرمنی کو شاندار وپر عظمت ملک میں تبدیل کرنے کا منصوبہ تھا۔

کچھ لبرل ماہر عمرانیات جن میں شوئم باؤم اور رالف وارن ڈورف شامل ہیں' نازی ازم کو ایک ایسا عنصر قرار دیتے ہیں کہ جس نے جرمنی میں سماجی انقلاب کے عمل کو تیز کر دیا۔ ان کے نقطہ نظر کے مطابق جب نازی اقتدار میں آئے تو وہ معاشرے کے سماجی ڈھانچہ میں

بڑی تبدیلیاں لے کر آئے۔ اس عمل میں انہوں نے بہت سے قدامت پرست اور فرسودہ اداروں اور روایات کو تبدیل کر دیا کہ جو ان لئے کے خطرناک تھیں' لیکن اس کی وجہ سے آگے چل کر تبدیلیوں کے لئے راہیں ہموار ہو گئیں۔ نازیوں کی ناکامی کے بعد مطلق العنانیت کا وہ ڈھانچہ جو بسمارک کے زمانہ جرمن معاشرہ کو اپنے آہنی تسلط میں جکڑے ہوئے تھا ٹوٹ گیا' اور اس کے نتیجہ میں لبرل جمہوریت کو پھلنے پھولنے اور آگے بڑھنے کے مواقع مل گئے۔

روز مرہ کی تاریخ سے جرمن معاشرہ کے بارے میں جو تاثر ملتا ہے وہ یہ کہ اگرچہ نازی دور میں بربریت اور ظلم پھیلا ہوا نظر آتا ہے مگر اس کے پیچھے عام لوگوں کی زندگی نارمل اور سیدھی سادھی تھی۔

ماضی کے بارے میں تحقیق و تفتیش کرنا اس سے سبق سیکھنا' یہ زندہ اور باعمل قوموں کا کام ہے تاکہ ماضی میں جو کچھ غلط ہوا اس تجربہ کی بنیاد پر یہ کوشش کرنی چاہئے کہ ایسا دوبارہ نہ ہو۔

قوم اور قوم پرستی

قوم اور قوم پرستی نہ صرف یورپ میں بلکہ ایشیا و افریقہ کے نئے آزاد ہونے والے ملکوں میں بڑی اہمیت کا حامل مسئلہ ہے۔ یورپ میں قوم پرستی اور قومی ریاستوں کا عروج کئی مراحل میں ہوا، مگر خاص طور سے فرانسیسی انقلاب کے بعد قوموں کی تشکیل اور قومی علامات بننے کا عمل تیز تر ہو گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب ایشیا و افریقہ میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف قومی تحریکیں شروع ہوئیں، تو ان ملکوں میں بھی قوم پرستی کے جذبات ابھرنا شروع ہوئے۔ اور آزادی کے بعد خاص طور سے ان ملکوں میں یہ مسائل سامنے آئے کہ قوم کی تشکیل کن بنیادوں پر کی جائے۔ اور کس طرح سے مختلف نسلی و سماجی جماعتوں کو جو مذہبی و لسانی طور پر علیحدہ علیحدہ ہیں انہیں ایک کیا جائے۔ کچھ اسی صورت حال سے پاکستان بھی دوچار ہے کہ یہاں بھی پاکستانی قوم کی تعمیر و تشکیل اب تک نہیں ہو پائی۔ ان تمام سوالات کا حل تاریخ کے اس عمل میں ہے کہ جس سے قوم پرستی اور قوم گذرتی ہے اور اس سوال کو حل کرنے کے لئے ای۔ جے ہابس بام کی کتاب "قومیں اور قوم پرستی ۱۷۵۰ء سے" انتہائی اہم ہے کیونکہ یہ کتاب بہت سے تاریخی مفروضوں کو ختم کرتی ہے اور قوم پرستی کی تشکیل میں کون سے عوامل کام کر رہے تھے ان کو ہمارے سامنے لاتی ہے۔

قوم کی تشکیل کے بارے میں جو بھی نظریات ابھر کر آئے، ان کی ابتداء یورپ سے ہوئی اس لئے ان نظریات کے سامنے جو ماڈل تھے وہ یورپ کے ملکوں اور ان کی تاریخ کے تھے۔ ان میں زبان، نسل، جغرافیائی حدود سے لے کر وہ تمام سامراجی نظریات بھی تھے کہ جو اس وقت نوآبادیاتی ملکوں کے مفادات کو پورا کر رہے تھے۔ مثلاً فرانس کے مفکر رینان نے کے نزدیک جو شخص جہاں بھی رہتا ہے وہ اس ملک یا اس علاقہ کا باشندہ اور شہری ہے۔ اس لئے اس کی قومیت بھی اس کی رہائش سے متعین ہوگی۔

یورپ میں قوم پرستی کے عروج میں جن عوامل نے حصہ لیا ان میں جنگوں، ان کے نتیجہ میں ہونیوالی فتوحات و شکستیں، ذرائع آمدورفت کی سہولتوں، اور تعلیم کے پھیلاؤ نے اہم حصہ لیا ہے۔ ہابس بام نے مشرقی یورپ کے ایک مصنف ہروش (Hroch) کے اس ماڈل کو پیش کیا ہے کہ جو اس نے یورپ کی تاریخ کو مدنظر رکھتے ہوئے بنایا ہے۔

اس کا کہنا ہے کہ معاشرہ میں قومی شعور کا ارتقاء غیر مساوی طور پر ہوتا ہے اور اس

میں کچھ علاقہ اور جماعتیں زیادہ باشعور ہو جاتی ہیں۔ اور کچھ آہستہ روی کے ساتھ ان کا ساتھ دیتی ہیں۔ قومی شعور حاصل کرنیوالوں میں عوام کہ جن میں کسان، مزدور، اور ملازم شامل ہوتے ہیں۔ یہ سب سے آخر میں آتے ہیں۔ مثلاً یورپ میں انیسویں صدی میں جو قومی شعور ابھرنا شروع ہوا اس کے تین مرحلے تھے۔ اول خالص ثقافتی، ادبی، اور لوک ورثہ پر مبنی اس میں کوئی قومی یا سیاسی مفادات شامل نہیں تھے، دوسرے مرحلہ میں سیاست داخل ہوتی ہے اور پر تشدد قوم پرست وجود میں آتے ہیں۔ اور تیسرے دور میں جا کر عوام کی حمایت حاصل کی جاتی ہے۔

ہابس بام نے ان عناصر کی نشاندہی کی ہے کہ جنہوں نے قوم کی تعمیر اور تشکیل میں مدد دی، مثلاً جرمنوں اور فرانسیسیوں نے زبان کی بنیاد پر قومی نظریہ کو فروغ دیا۔ اور بنیادی طور پر اس اصول کو صحیح تسلیم کیا کہ اگر قومی نظریہ کی بنیاد پر مختلف جماعتیں متحد ہوتی ہیں تو یہ جائز ہے، لیکن اگر یہ متحد کرنے کے بجائے انہیں تقسیم کرتا ہے تو اس صورت میں یہ ناجائز ہے۔ اس لئے قومی تحریکوں کا مقصد اتحاد ہونا چاہئے۔ اس لئے انیسویں صدی میں قومی تحریک کا مقصد تھا کہ کئی زبانوں، نسلوں، اور قومیتوں کو یکجا کیا جائے کیونکہ اسٹورٹ مل کے بقول چھوٹی قومیتیں اگر بڑی قومیتوں میں ضم ہو جائیں گی تو وہ اسی صورت میں کچھ حاصل کر سکیں گی۔ یہی بات جرمن مصنف لسٹ (List) نے کہی کہ جس قوم میں زیادہ آبادی ہو اور جو وسیع ذرائع کی مالک ہو تو وہ جلدی ترقی کرے گی لیکن جس قوم کی آبادی کم ہو گی اور جس کا علاقہ محدود ہو گا اور اس کی علیحدہ سے زبان ہو گی تو ایک ایسی قوم تنگ، محدود، اور مفلوج قسم کے ادب، آرٹ اور اداروں کو پیدا کرے گی۔

اس لئے انیسوں صدی کے یورپ میں قوم پرستی کو سیاسی مقصد کے لئے استعمال کیا جا رہا تھا کہ اس کے ذریعہ سے کئی زبانیں بولنے والوں، نسلی، مذہبی، اور مختلف قومیتوں کو یکجا کر کے ان کو ایک قوم بنایا جائے۔

کسی ایک قوم کی کیا خصوصیات ہوتی ہیں۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے ہابس بام نے اس کے تین پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے اول، کسی ریاست کے ساتھ تاریخی وابستگی، یہ وابستگی طویل بھی ہو سکتی ہے اور کم عرصہ کی بھی، دوم ایک تعلیم یافتہ اور ثقافتی طبقہ کی موجودگی، اور تحریری ادب کا ہونا۔ سوم اس میں اس اہلیت کا ہونا کہ وہ مختلف جماعتوں کو متحد کر سکے۔

قوموں کی تشکیل میں ایک بڑا عنصر زبان کا رہا ہے۔ اس بارے میں ہابس بام کے کہنا

ہے کہ جن زبانوں پر قومیت کی تعمیر ہوتی ہے وہ نقلی اور مصنوعی ہوتی ہیں۔ کیونکہ ہوتا یہ ہے کہ جو زبان بولی جاتی ہے اس کے لہجوں میں سے کسی ایک کو چن لیا جاتا ہے اور اسے ثقافت اور معاشرہ کے ذہن کو بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ زبان ہمیشہ حکمران طبقوں اور تعلیم یافتہ طبقے کے مفادات کو فروغ دیتی ہے۔ وہ زبان کو معیاری بناتے ہیں۔ اور اس طرح عوام اور خواص میں فرق کو قائم رکھتے ہیں۔ چنانچہ ۱۷۸۹ء میں فرانس میں پچاس فیصد آبادی فرانسیسی نہیں بولتی تھی' اور جب اٹلی کا اتحاد ہوا ہے تو اس وقت ڈھائی فیصد لوگ اطالوی زبان کو روز مرہ کے استعمال کے لئے بولتے تھے۔ اور ستم ظریفی یہ تھی کہ یہ چھوٹی سے اقلیت خود کو "اطالوی عوام" کہتی تھی۔

اس لئے زبان کی بنیاد پر قوم پرستی میں وہ زبان استعمال ہوتی تھی کہ جو انتظامی امور اور سرکاری کارروائی میں کام آتی تھی۔ اور زبان کے بارے میں لوگوں میں شعور اس وقت بڑھا کہ جب مردم شماری میں ان سے ان کی مادری زبان کے بارے میں سوالات کئے گئے۔ اس نے ان میں لسانی قوم پرستی کو پیدا کیا۔

۱۸۸۰ء سے لے کر ۱۹۱۴ء کے درمیان جو تبدیلیاں آئیں۔ اس کے نتیجہ میں ہر قوم کو حق خود اختیاری دیدیا گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہر قوم کو یہ حق ہے کہ وہ اپنا علیحدہ سے ملک یا ریاست بنائے' قوم کی تشکیل کے دو بنیادی عنصر لسانی اور نسلی وحدت قرار پائے اور قومی ریاست بنانے کے لئے جرمنوں اور اطالویوں نے جدوجہد کی کہ جس کی بنیاد زبان تھی۔ اس کے علاوہ پہلی جنگ عظیم کے بعد یورپ کی سیاسی صورت حال بڑی تیزی سے تبدیل ہوئی' سب سے اہم بات تو یہ تھی کہ جمہوری عمل تیزی سے پھیلا جس کی وجہ سے جمہوری اداروں میں لوگوں کی شمولیت بڑھ گئی' لوگوں کی آمدورفت ایک دوسرے کے ملک میں زیادہ ہونے لگی' ساتھ ہی میں مختلف وجوہات کی بنا پر لوگ ایک ملک سے ہجرت کر کے دوسرے ملک میں جانے لگے' اس نے مقامی ثقافتی تعصبات کو توڑ ڈالا' مادری زبان کا جو تصور اب تک بڑا اہم اور قومی شناخت سے منسلک تھا وہ ختم ہو گیا' لوگ وہ زبانیں سیکھنے لگے کہ جن سے ان کے مادی مفادات وابستہ تھے' وہ لوگ کہ جو ایک زبان بولنے پر اصرار کرتے تھے ثقافتی طور پر پس ماندہ ہو گئے۔ یورپ کے چھوٹے چھوٹے ملکوں میں جیسے کہ بلجیم' ہالینڈ' اور اسکینڈی نیوی ممالک ہیں وہ مادری زبان کے ساتھ دوسری بین الاقوامی زبانیں سیکھتے ہیں کہ جس کی وجہ سے ان کا رابطہ وسیع ثقافت سے ہو جاتا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے نتیجہ میں دو ایسی بڑی سلطنتیں ختم ہوئیں کہ جو بین الاقوامی تھیں'

یعنی ہیپسبرگ (Hapsburg) اور عثمانیہ' اور ان کے ٹوٹنے سے جو ریاستیں وجود میں آئیں وہ قومی تھیں۔ یہ ساز میں چھوٹی تھیں۔ اور ان میں سے اکثر نے یہ کوشش کی کہ ایک قوم کی تشکیل کے لئے ایسے گروپوں کو کہ جن کا ان سے نسلی تعلق نہیں تھا انہیں باہر نکال دیا جائے۔ چنانچہ ترکی نے آرمینیوں اور یونانیوں کو نکالا' تو پولینڈ اور چیکوسلواکیہ نے جرمنوں کو' یا یہ کوشش کی گئی کہ ایسے تمام گروپوں کہ جو اتحاد میں رکاوٹ ہیں انہیں بالکل ختم ہی کر دیا جائے۔

قومی ریاستوں کے استحکام میں ایک اور اہم عنصر روسی انقلاب کا تھا۔ اور اتحادیوں نے اس انقلاب کو روکنے کی خاطر امریکہ کے صدر ولسن کے اصول کا سہارا لیا کہ جس میں ہر قوم کو خود مختاری کا حق دیا گیا تھا۔ اور یورپ کی ریاستوں کو قومیت کی بنیادوں پر مضبوط کیا گیا تاکہ روسی انقلاب کی بین الاقوامیت کو روکا جائے' اور اسی کے نتیجہ میں جرمنی اور اٹلی میں پرتشدد قسم کی قوم پرستی ابھری۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ایشیاء و افریقہ میں نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ' انقلابات' اور عالمی طاقتوں کی دخل اندازی کی وجہ سے نئی قومی ریاستیں وجود میں آئیں۔ مگر ان کی خصوصیت پہلی جنگ عظیم کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ریاستوں سے جدا تھی۔ کیونکہ ان کی سرحدیں' اور قوموں کی تقسیم نوآبادیاتی نظام نے اپنی مرضی سے کی تھی جس کے نتیجہ میں قومیں لسانی' نسلی' اور سماجی طور پر تقسیم تھیں۔ اور اس لئے ان ریاستوں میں ایک قوم کی تشکیل مشکل ہوئی۔

فاشزم

فاشزم کی اصطلاح اب ہمارے معاشرے میں بہت عام ہو گئی ہے' اور یہ ہر اس عمل کے لئے استعمال کی جاتی ہے کہ جو انفرادی آزادی یا اجتماعی سرگرمیوں کو ختم کرنے کے لئے کیا جاتا ہے اس لئے چاہے فرد ہو' جماعت ہو' یا گورنمنٹ' اگر وہ معاشرے میں کسی ایک نظریہ' رائے' یا احکامات کو جبر و تشدد' اور قوت کے ساتھ نافذ کرے تو یہ فاشزم کے دائرے میں آتا ہے فاشزم کی تعریف کرتے ہوئے مارٹن کیچن نے کہ جنہوں نے اس نام سے ایک مختصر کتاب لکھی ہے کہتے ہیں کہ فاشزم کی تعریف کرتے ہوئے یا اس اصطلاح کی وضاحت کرتے ہوئے ضروری ہے کہ یہ تحریک جن سماجی حالات میں پیدا ہوئی ہے انہیں دیکھنا اور ان کا تجزیہ کرنا چاہئے۔ اس کو کسی قوم کے قومی کردار' یا نفسیات سے منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ فاشزم ایک ایسے معاشرے میں پیدا ہوتا کہ جہاں فرد کی آزادی کو ترقی کرنے اور اسے پنپنے کے مواقع میسر نہیں آتے ہیں۔

فاشزم کی ابتداء جدید دور میں اٹلی اور جرمنی میں ہوئی' اور ایسے حالات میں ہوئی کہ جب ان دونوں ملکوں میں کیمونسٹ پارٹیاں نہ صرف مقبول تھیں بلکہ سرگرم بھی تھیں' مگر جیسے ہی فاشزم کا عروج ہوا تو اس نے ان ملکوں میں کیمونسٹ پارٹیوں کو سخت نقصان پہنچایا کیونکہ فاشزم کی تحریک میں اتنی وسعت تھی کہ اس میں نہ صرف سرمایہ دار شامل ہوئے بلکہ پرولتاری طبقہ بھی بڑے جوش و خروش سے اس کا ایک حصہ بن گیا۔ اس لئے کیمونسٹوں نے جب فاشزم کا تجزیہ کیا اور اس سوال کو اٹھایا کہ آخر کیوں مزدور طبقہ انہیں چھوڑ کر فاشزم سے منسلک ہو گیا تو اس کی وجہ انہوں نے سرمایہ داری نظام کے تضادات میں ڈھونڈی' ان کے برعکس سماجی ماہرین علوم نے فاشزم کے نظریات کے مطالعہ کے بعد اس کا اظہار کیا کہ فاشزم کی بنیادیں جن نظریات پر استوار ہوتی ہیں' ان میں جمہوریت کی مخالفت اور مزدوروں کی متحدہ جماعت سے انکار ہوتا ہے' یہ اپنی مہم کو اس طرح سے سر کرتے ہیں کہ عوام ان سے متاثر ہو کر ان میں شامل بھی ہوں' مگر ساتھ ساتھ معاشرہ کا جو سماجی' سیاسی' اور معاشی ڈھانچہ ہے وہ بھی تبدیل نہ ہو' اس لئے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ طبقاتی تضادات کو دور کر کے یا کم کر کے پارٹی کے مفادات کے ذریعہ سب کو آپس میں ملا دیا جائے' اور لوگوں کے ذہن میں یہ بٹھایا جائے کہ معاشرہ کے ڈسپلن کے لئے کسی طاقت کا ہونا ضروری ہے' وہ طاقت چاہے ایک باپ کی خاندان میں ہو' یا حکومت میں راہنما کی

ہو۔ اکثر معاشرہ کی تمام خرابیوں کی ذمہ داری یہ اقلیتوں پر ڈالتے ہیں' اور لوگوں کی بے چینی اور دباؤ کو کم کرنے کے لئے انہیں اپنا شکار بناتے ہیں۔

فاشزم میں تین عناصر انتہائی اہم کردار ادا کرتے ہیں' ایک اس کا پرتشدد قوم پرست ہونا اور قوم پرستی کی بنیاد پر عوام کو پارٹی میں شامل کر کے اسے مقبول بنانا' پھر پارٹی کی قیادت ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہوتا کہ جو لوگوں کو اپنی تقریر کے ذریعہ سحر زدہ کر دے' اور نتیجہ یہ ہو کہ لوگ اس پر اندھا اعتقاد کرنے لگیں' اور ساتھ ہی میں کسی ایک نظریہ کا ہونا۔

فرانز نیومن جو ایک سماجی علوم کا ماہر ہے اس کا کہنا ہے کہ فاشزم لبرل بورژوا معاشرہ میں پیدا ہوتا ہے' اور یہ جمہوریت مخالف جماعتوں کو ختم کر کے معاشرہ میں استحکام کو پیدا کرتا ہے' اور معاشی مسائل کو اس طرح سے حل کیا جاتا ہے کہ ملک میں جبر و تشدد کے ذریعہ اسلحہ بنانے کے کارخانے لگائے جاتے ہیں اور ان کے ذریعہ لوگوں کو ملازمت فراہم کی جاتی ہے ارنسٹ نولٹے' جو کہ فاشزم کے ماہرین میں سے ایک ہے' اس نے فاشزم کی مختلف زاویوں سے تعریف کی ہے۔ مثلاً عیسائیوں کے نزدیک فاشزم اس لئے پیدا ہوا کہ یورپی معاشرہ سیکولر ہو گیا اور اس میں مذہب کی حیثیت کمزور ہو گئی' اس لئے اس کا مقابلہ اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے کہ جب معاشرہ کو مذہبی بنا دیا جائے۔ قدامت پرستوں کے لئے فاشزم کے ذریعہ عوام لبرل اور جدید خیالات و نظریات کے خلاف بغاوت کرتے ہیں' اس لئے ماضی کی طرف واپسی ہی معاشرہ میں استحکام پیدا کر سکتی ہے۔

نولٹے نے اپنے مطالعہ میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ماضی میں فاشزم اس لئے جڑ پکڑ سکا اور مقبول ہوا کیونکہ لبرل ازم اپنے مقاصد میں ناکام ہو گیا' بنیادی طور پر فاشزم مارکسی نظریہ کے خلاف ہوتا ہے اور یہ اسے اسی کے حربوں کے ذریعہ ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ان کے مقابلہ میں کیچن نے فاشزم کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے' اٹلی اور جرمنی میں ان کے عروج کا تجزیہ کیا ہے' اس کے نظریہ کے مطابق' اٹلی میں سرمایہ داروں کا یہ مطالبہ تھا کہ مزدوروں کو کم سے کم تنخواہیں دی جائیں' اور اس لئے وہ ان مزدور یونینوں کا خاتمہ چاہتے تھے کہ جو متحدہ ہو کر کام کر رہی تھیں' ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ حکومت معاشی بحرانوں میں ان کی مدد کرے' اور ان کی اشیاء کو ٹیکسوں سے چھوٹ دے دے۔

جرمنی میں بھی سرمایہ دار جمہوریت کے مخالف تھے' اور ساتھ ہی میں مزدور جماعتوں

سے خوف زدہ تھے' اس لئے ان دونوں ملکوں میں سرمایہ داروں نے فاشزم کی حمایت کی تاکہ جمہوریت قدروں اور روایات کو ختم کر کے' اور مزدوروں کے اتحاد کو توڑ کر وہ ان کا استحصال کر سکیں۔

ٹسچن نے فاشزم کی جن بنیادی خصوصیات کا ذکر کیا ہے وہ اس طرح سے ہیں:

۱- یہ ترقی یافتہ' صنعتی معاشروں میں پیدا ہوتا ہے۔

۲- یہ ایسے سیاسی' سماجی' اور معاشی بحرانوں کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے کہ جن میں معاشرے کے کچھ گروہ اور جماعتیں اپنی مراعات' اور حیثیت کو کھو دیتی ہیں' اور ان میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔

۳- متحدہ مزدور جماعتیں سرمایہ داروں کو پریشانی کر دیتی ہیں' اور وہ فاشزم کی حمایت کر کے ان کے اتحاد اور قوت کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے فاشزم صرف اسی وقت کامیاب ہوتا ہے کہ جب مزدور جماعتیں شکست کھا جائیں' جیسا کہ ۱۹۲۰ء میں اٹلی میں ہوا اور ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۳ء میں جرمنی میں ہوا۔

۴- اس کے حمایتی اکثر نچلے درجوں کے متوسط طبقے سے ہوتے ہیں' جیسے صنعت کار' ہنرمند' دستکار' چھوٹے دوکاندار' اور کسان' اور ان کا مفاد یہ ہوتا ہے کہ شاید اس تحریک کے ذریعہ وہ اپنے مقاصد حاصل کر سکیں

۵- یہ نجی جائداد اور سرمایہ داری کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔

۶- یہ اپنے مخالفوں کو تشدد' جبر' اور خوف سے خاموش کرتا ہے۔

۷- یہ عوام کو متوجہ کرنے کے لئے کسی نظریہ کا سہارا لیتا ہے' اور ان کی بے چینی کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اس خاص خصوصیات میں' اتھارٹی' اطاعت' عزت' فرض' مادر وطن' اور نسل کی برتری ہوتی ہیں۔

۸- یہ جارحانہ اور وسعت پسندانہ پالیسی کو اختیار کرتا ہے۔

اگر دیکھا جائے تو وہ سماجی اور معاشی نظام کو جو فاشزم کو پیدا کرتے ہیں اس وقت بھی موجود ہیں۔ فاشزم کے رجحانات کو ارک فرام کے الفاظ میں اسی صورت میں روکا جا سکتا ہے کہ جب فرد کی تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کو جمہوری اور اشتراکی معاشرے میں آزادی کے ساتھ نشوونما پانے اور پھلنے پھولنے کا موقع ملے۔

جب بھی ان کے درمیان رکاوٹ ڈالی جائے گی فاشزم کی ہولناکیاں معاشرے کو تباہ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گی۔

فرانسیسی انقلاب

۱۷۸۹ء میں فرانسیسی انقلاب کی دو سو سالہ سالگرہ دنیا بھر میں منائی گئی' اس موقع پر مورخوں نے فرانسیسی انقلاب اور اس کی تاریخ پر مختلف زاویوں اور نقطہ ہائے نظر سے لکھا' فرانسیسی انقلاب جب سے کہ یہ آیا ہے' اس وقت سے مورخوں کے لئے انتہائی دلچسپ اور پسندیدہ موضوع رہا ہے اور انہوں نے انقلاب کے نتیجہ میں ہونے والی تبدیلیوں' اور انقلاب کے دوران نظریات کی کش مکش' افراد کا تصادم' شخصیتوں کے جھگڑے' طبقاتی جدوجہد' کسانوں کی بغاوت' مختلف نظریاتی گروہوں کا وجود میں آنا' بغاوتیں' انتشار' دہشت گردی' ڈر' خوف' اور اس کے ساتھ ہی میں نئے نئے نظریات کا پیدا ہونا' نئے تجربات کا کرنا' اور کئی علامتیں وجود میں آنا' اس انقلاب کی خصوصیات تھیں' دنیا میں بہت کم ایسے واقعات ہیں کہ جنہوں نے انسانی معاشروں' اور قوموں کو اس قدر متاثر کیا ہو جیسا کہ فرانسیسی انقلاب نے۔

ایک مشہور جرمنی مورخ کارل فون روتک (۱۸۴۸) نے اس کی طرف نشان دہی کرتے ہوئے کہا کہ رومیوں کا زوال' عیسائی مذہب کا آنا' صلیبی جنگیں' تحریک اصلاح مذہب اور پرنٹنگ پریس کی ایجاد اگرچہ یہ سب انتہائی اہم واقعات ہیں کہ جنہوں نے دنیا کی تاریخ پر انتہائی اہم اثرات ڈالے ہیں' مگر ان واقعات کے نتیجہ میں دنیا آہستہ آہستہ اور مرحلہ وار تبدیل ہوئی' جب کہ فرانسیسی انقلاب کی دنیا انتہائی اچانک' غیر متوقع اور سرعت کے ساتھ تبدیل ہوئی کہ اس نے سب کو حیران کر دیا' اور ساتھ ہی میں اس نے صرف یورپ کے براعظم ہی کو نہیں بدلا بلکہ اس کے اثرات دنیا کے کونے کونے میں کسی نہ کسی شکل میں پہنچے۔ اس لحاظ سے یہ دنیا کا ایک اہم واقعہ ہے۔

انقلاب کے دوران اس قدر سیاسی' معاشی اور سماجی تجربات ہوئے' اور معاشرے کو بدلنے کی کوشش کی گئی کہ آگے چل کر بہت سے ملکوں نے ان تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے معاشروں کو تبدیل کیا' خاص طور پر انقلاب کے دوران جو علامتیں اختیار کی گئیں وہ بہت سے ملکوں میں بعد میں رائج ہوئیں۔ مثلاً فرانس کا تین رنگوں والا جھنڈا' بہت سے آزاد ملکوں نے اختیار کیا' اگرچہ انہوں نے رنگوں کا انتخاب اپنی خواہش و حالات کے مطابق کیا' لہٰذا اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۹۲۰ء کی دھائی تقریباً ۲۲ ایشیائی و افریقی ملکوں نے تین رنگوں والے جھنڈے کو اپنایا' اور ان کے ذریعہ قوموں' نسلوں' مذہبوں' اور طبقوں کی

ہم آہنگی کو ظاہر کیا۔

فرانسیسی انقلاب ترانہ جرمن اور آسٹرین ڈیموکریٹک پارٹیوں نے اختیار کیا' جب کہ مساوات' آزادی' اور اخوت کے نعرے دنیا کے کونے کونے میں مقبول ہو گئے۔ انقلاب کے اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے' انگریز مورخ ای۔ جے۔ ہابس بام لکھتا ہے کہ "آدھی دنیا کا قانونی نظام ان قوانین پر ہے جو کہ انقلاب کے دوران بنائے گئے۔ وہ ملک بھی کہ جو فرانس سے بہت دور ہیں' جیسے کہ اسلامی بنیاد پرست ایران' وہ بھی آج اسی قومیت کی بنیادوں پر ہیں کہ جس کی ابتداء فرانسیسی انقلاب نے کی تھی' اور ان کی سیاسی اصطلاحات میں سے اکثر وہی ہیں جو کہ انقلاب کے دوران وضع کی گئیں تھیں۔"

فرانسیسی اپنے انقلاب پر اس لئے فخر کرتے ہیں کہ انہ نے دنیا کو بدل ڈالا' اس لئے وہ اپنی ان قربانیوں کا ذکر کرتے ہیں کہ جن کی وجہ سے یہاں انقلاب کامیاب ہوا۔ اس لحاظ سے ان کا فخر بجا ہے کہ انہوں نے قربانیاں دے کر' اور بھاری قیمت ادا کر کے دنیا کو مطلق العنانیت اور استبدادی نظام سے چھٹکارا پانے میں مدد دی' اور وہ ملک کہ جہاں آج بھی استحصالی نظام ہے ان کے لئے فرانسیسی انقلاب راہنمائی کا کام کرتا ہے۔

تاریخ میں فرانسیسی انقلاب نے راہنمائی کا کام سرانجام دیا ہے' اس کے شواہد ہمیں یورپ کے ۱۸۳۰ء' ۱۸۴۸ء کے انقلابوں میں ملتے ہیں' اور روس میں جو ۱۹۱۷ء کا انقلاب آیا' اس میں بھی فرانسیسی انقلاب سے حاصل شدہ تجربوں کی جھلک ملتی ہے۔

فرانسی انقلاب نے ایک طرف تو انقلابوں' اور تبدیلی لانے والوں کو متحد کیا' تو دوسری طرف اس سے رجعت پسند حکمران طبقوں نے بھی سبق حاصل کیا' کہ کس طرح سے تبدیلی کی ان تحریکوں کو روکا جائے اور کس طرح سے پرانے نظام کو برقرار رکھا جائے' اس لئے حکراں طبقوں نے انقلاب کے منفی پہلوؤں پر زیادہ زور دیا اور خصوصیت سے اس کے ۱۷۹۳ء اور ۱۸۹۴ء والے پہلو کو خوب اجاگر کیا کہ جسے "تشدد کا زمانہ" کہا جاتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہر انقلاب انتشار' بے چینی' افراتفری' اور قتل و غارت گری کے ذریعہ امن و امان اور ڈسپلن کو تباہ کر دیتا ہے۔ اس تاثر کو پیدا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ تبدیلی ہمیشہ منفی اثرات کی حامل ہوتی ہے۔

ہوبس بام نے فرانسیسی انقلاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس نے لوگوں کو تاریخی شعور دیا' اور یہ سبق دیا کہ تاریخ ان کے عمل سے تبدیل ہو سکتی ہے۔" اس کا خیال ہے کہ فرانسیسی انقلاب نے دنیا میں تبدیلی کے عمل کو مستقل طور پر جاری کر دیا ہے'

اور اس کی سب سے بڑی مثال مشرقی یورپ اور روس کے واقعات ہیں' کہ جہاں تمام رکاوٹوں کے باوجود تبدیلی آئی۔

امریکی تاریخ کی تشکیل

امریکہ کی دریافت میں چونکہ ابتدائی سرمایہ کاری اسپین نے کی تھی اس لئے یورپی جنگ جوؤں اور مہم جوؤں کا پہلا مقصد یہ تھا کہ یہاں سے جس قدر دولت لوٹی جا سکے اسے لوٹا جائے اس لئے انہوں نے مقامی باشندوں کا قتل عام کیا۔ اور یہاں کی پرانی تہذیبوں کو تہس نہس کر کے سونے کے ذخیروں کو لوٹا اور اس دولت کو یہ یورپی ممالک لے گئے۔

لیکن نئی دنیا کی دریافت نے مہم جوؤں کے ساتھ ساتھ ان فرقوں' جماعتوں' اور گروپوں کے لئے مواقع فراہم کئے کہ جو یورپ میں نسلی و مذہبی' اور نظریاتی بنیادوں پر تعصب کا شکار تھیں' امریکہ کے وسیع و عریض براعظم میں انہیں اس بات کی آزادی مل گئی کہ وہ کسی دور دراز علاقہ میں علیحدہ سے اپنے عقائد' رسوم و روایات کی پیروی کر سکیں۔

اس لئے نئی دنیا میں آنیوالوں کی اکثریت ان لوگوں کی تھی کہ جو پرانی دنیا سے مایوس تھے۔ اور جہاں انہیں اپنا روشن مستقبل نظر نہیں آتا تھا۔ اور نئی دنیا میں وہ ان امیدوں کے ساتھ آئے تھے کہ یہاں وہ محرومیوں کا ازالہ کر سکیں گے۔ اس لئے ان مہاجرین کی نظر میں نئی دنیا ایک ایسی سرزمین تھی کہ جہاں امن و امان و خوش حالی تھی۔ جو بدعنوانیوں اور گناہوں سے پاک تھی۔ اور جو ان کے لئے جنت ارضی تھی۔ اس کے مقابلہ میں پرانی دنیا برائیوں اور گناہوں کے بوجھ سے دبی' گندگی و غلاظت سے آلودہ تھی۔ اس کی وجہ سے ان لوگوں میں نئی دنیا کا جو تصور ابھرا وہ معصومیت کا تھا۔ اور اس معصومیت کے جذبہ سے بھرپور ہو کر نئے آنیوالوں نے ایک نوجوان معاشرہ کی تعمیر کرنا شروع کی۔

امریکہ کے ایک مشہور مورخ فریڈرک جیکسن ٹرنر نے "امریکی تاریخ میں سرحد" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی۔ جس میں اس نے کہا کہ جیسے جیسے امریکہ کی سرحدیں بڑھتی رہیں' اسی طرح سے وہ یورپ کے اثر سے آزاد ہوتا رہا اور اس کی زندگی میں آزادی اور خود مختاری بڑھتی رہی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ امریکہ کے ادارے خود اس کی اپنی ضروریات کے نتیجہ میں تشکیل ہوئے۔ اور امریکہ کی جمہوریت کسی نظریہ داں کے ذہن کی پیداوار نہیں ہے۔ اور نہ ہی اسے یورپ سے برآمد کیا گیا ہے۔ بلکہ یہ امریکہ کے جنگلوں کی پیداوار ہے۔ اس بات کو امریکہ کے ایک اور مورخ چارلس بیرڈ نے بھی دھرایا ہے کہ امریکی معاشرہ کی تشکیل اس کے اندرونی تضادات کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے اور جمہوری روایات کا ارتقاء اور ترقی معاشی مفادات کے تصادم کے نتیجہ میں ہوئی' یہ تصادم زرعی اور

صنعتی مفادات کے رکھنے والوں' ذاتی و نجی ملکیت والوں اور قرض داروں' مزدوروں اور سرمایہ داروں' اور قدامت پسند انقلابیوں کے درمیان ہوا۔

یہ اس بات کی کوشش تھی کہ امریکی معاشرہ کو یورپ کے اثر اور تسلط سے آزاد کرایا جائے' اور اس کا اپنا مقام متعین کیا جائے۔ کیونکہ صرف اسی صورت میں ایک آزاد امریکی قوم کی شناخت بن پائے گی۔

امریکی معاشرے کی آزادانہ تشکیل میں اہم پہلو یہ رہے کہ اول تو یہ ان تمام تاریخی ادوار سے نہیں گزرا جیسے کہ یورپ یا ایشیا کے بہت سے معاشرے گزرے تھے' یعنی اس کی تاریخ میں دور جاگیرداری نہیں ہے' دوسرا یہ ہے کہ امریکی معاشرہ کو فطری تحفظ حاصل رہا' اور اس میں جو نئے نوآبادگار آتے رہے وہ اس کی سرحدوں کو مسلسل بڑھاتے رہے' اور فطری تحفظ کی وجہ سے یہ معاشرہ برابر ترقی کرتا رہا اور آگے کی جانب بڑھتا رہا' اگرچہ اس معاشرہ کی تاریخ بڑی مختصر رہی' اور اس کا کوئی ماضی نہیں رہا' اس لئے ماضی کا بوجھ ان کے ورثہ میں نہیں آیا' اور انہیں اس بات کا موقع مل گیا کہ وہ نئے سرے سے اپنی تاریخ کی تشکیل کریں۔ لیکن دوسری طرف یہاں یہ بھی محسوس کیا گیا کہ بغیر ماضی کے ان کے پاس کوئی ورثہ نہیں ہے کہ جس پر یہ فخر کر سکیں۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ہنری جیمس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "کوئی بادشاہ نہیں' کوئی دربار نہیں' کسی ذاتی وفاداری کا تصور نہیں' کوئی طبقہ امراء نہیں' کوئی چرچ نہیں' کوئی فوج نہیں' کوئی سفارت کاروں کا حلقہ نہیں'.... کوئی محلات نہیں' قلعے نہیں..."

اس لئے ابتدائی دور میں امریکی معاشرہ کو یہ دقت تھی کہ اس کی اپنی کوئی شناخت نہیں تھی۔ کیونکہ یہاں پر آکر آباد ہونیوالوں میں مختلف اقوام تھیں کہ جن کا تعلق مذہبی' نسلی' اور لسانی طور پر علیحدہ علیحدہ تھا' لہذا اس کی محفوظ سرحدوں میں ایک ایسی قوم کی تشکیل ہونا شروع ہوئی کہ جن کا تعلق اگرچہ علیحدہ ثقافتوں سے تھا' مگر ان کے معاشی و سیاسی مفادات نے انہیں ہم آہنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔

امریکی معاشرہ نے معصومیت کے تصور کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے ان گناہوں کو بالکل نظر انداز کر دیا کہ جو انہوں نے مقامی باشندوں اور افریقہ سے زبردستی لائے ہوئے اور بنائے غلاموں کے ساتھ کئے تھے۔ مقامی باشندوں کے قتل عام اور ان کی تہذیب کو تباہ و برباد کرنے کے جواز اس طرح سے نکالے گئے کہ یہ تاریخی عمل کا حصہ تھا اور تاریخ میں جب بھی مہذب اور غیر مہذب اقوام میں تصادم ہوتا ہے تو اس میں پس ماندہ اقوام تباہ ہو

جاتی ہیں۔ تاریخ کو بیان کرتے ہوئے جو تاثر دیا گیا وہ یہ تھا کہ امریکہ ایک خالی اور ویران براعظم تھا۔ کہ جس کی بنجر زمینوں کو نئے آباد ہونیوالوں نے اپنی محنت و مشقت سے سرسبز کیا' اس لئے ان کی اس تاریخ میں مقامی باشندوں پر ظلم و ستم کہیں نظر نہیں آتا۔ یہی کچھ افریقی باشندوں کے ساتھ کئے گئے سلوک میں تھا۔ ان دونوں صورتوں میں "احساس جرم" کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔

معصومیت کے ساتھ دوسری اہم خصوصیت جو امریکہ کی ترقی کے بعد پیدا ہوئی وہ یہ تھی کہ امریکی معاشرہ "ناقابل تسخیر ہے" ان کے اس نظریہ کو اس وقت اور تقویت ملی جب پہلی اور دوسری جنگوں میں فتوحات کے نتیجہ میں امریکیوں کو زبردست فوائد ہوئے اور ناقابل تسخیر قوت اس وقت زبردست طور پر متاثر ہوئی کہ جب ویت نام میں انہیں زبردست ناکامیاں ہوئیں۔ اپنے اس تصور' اور حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے امریکی ہر ہتھیار اور حربے کو استعمال کرنا چاہتے ہیں' اسی لئے دنیا میں پہلی مرتبہ ہیروشیما و ناگاساکی پر ایٹم بم پھینکنے والے یہی تھے۔ ویت نام کی جنگ میں ان کے ناقابل تسخیر حیثیت کو جو نقصان پہنچا اس کا ازالہ انہوں نے خلیج کی جنگ میں کر لیا' اور اسی لئے بش کا یہ بیان اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے بعد سے امریکیوں سے ویت نام کی شکست کا داغ دھل گیا۔ اس کی یہی ناقابل تسخیر ذہنیت ہے کہ جو امریکہ کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ اپنا تسلط دنیا میں قائم کرے۔ اس مقصد کی تکمیل میں سی۔ آئی۔ اے کا ادارہ اس کی مدد کر رہا ہے کہ جو تیسری دنیا کے ملکوں میں حکومتوں کے تختے الٹتا ہے۔ سربراہوں کو قتل کرواتا ہے' اور انہیں سزا دیتا ہے۔

اس لئے معصومیت اور ناقابل تسخیر' یہ دونوں خصوصیات امریکی معاشرہ میں ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ احساس جرم کے جذبات بہت دبے ہوئے ہیں۔ اس لئے جب تک یہ پوری طرح سے ابھر کر نہیں آئیں گے اس وقت تک امریکہ کے آمرانہ رویہ باقی رہیں گے۔

عثمانی خلافت کے ختم ہونے کے نتیجہ میں' اور پہلی جنگ عظیم کے بعد عرب قومی ریاستیں تشکیل نہیں پا سکیں' کیونکہ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ان ریاستوں کو اپنے زیر تسلط کر لیا۔ اس لئے عربوں میں ان دونوں کے خلاف شدید رد عمل ہوا' اور اس رد عمل میں عرب' قوم پرستی کی جڑیں اور مضبوط ہوئیں' مگر عرب نے فرانسیسی اور برطانوی قوم پرستی کے ماڈل کو اختیار نہیں کیا کیونکہ اس ماڈل میں انہیں ابھرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا' اور عربوں کے حالات جس قسم کے تھے اس میں یہ ماڈل پورا بھی نہیں اترتا تھا کیونکہ اس ماڈل میں کوئی بھی قوم بغیر ریاست کے تشکیل نہیں ہو سکتی ہے۔ مشہور فلسفی رینان نے جو قوم پرستی کا نظریہ دیا اس میں یہ دلیل دی کہ قوموں کی تشکیل میں باہمی ثقافت رکھنے والے گروہوں اور جماعتوں کا اتحاد ہی کافی نہیں' بلکہ تاریخی طور پر قوم بننے کے عمل میں شاہی خاندانوں کے حملے' فتوحات اور سرحدوں کی تبدیلی نے اہم کردار ادا کیا ہے' اس لئے جو گروہ ایک سرحد میں آ گئے وہ ایک قوم کا حصہ بن گئے۔ اس دلیل کے مطابق فرانسیسی قوم اس طرح سے وجود میں آئی ہے چنانچہ رینان کے مطابق' قوم بنانے میں زبان' مذہب' معاشی مفادات' اور جغرافیہ شامل ہیں۔ اس کی بنیاد کسی خاص نسل پر بھی نہیں ہوتی' بلکہ قوم اس روحانی عنصر سے بنتی ہے جو کہ مشترکہ ماضی کے شعور سے ابھرتا ہے۔ قوم میں نئے گروہ اور جماعتیں شامل بھی ہوتی رہتی ہیں' اور یہ اس سے علیحدہ بھی ہوتے رہتی ہیں' چونکہ قومیں تاریخی عمل کی پیداوار ہیں اس لئے ان میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔

اس کے مقابلہ میں جرمنوں نے جو قوم کا نظریہ دیا' اس میں زبان قوم کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے' ہرڈر' فشے اور ارنڈٹ نے جرمن قوم کی اس خصوصیت پر روشنی ڈالی ہے' اس لئے عربوں نے زبان کی بنیاد پر قوم کی تشکیل کا ماڈل اختیار کیا' کیونکہ یہ ان کے سیاسی حالات میں ان کے لئے مناسب تھا۔

اس وجہ سے عرب دانشوروں نے جن میں خصوصیت سے الحصری اہم ہے' زبان کی بنیاد پر عرب قوم پرستی کی تشکیل شروع کی' اس کی دلیل کے مطابق زبان اس لئے اہم ہے کہ مذہب کو بھی زبان ہی کے ذریعہ سمجھا جاتا ہے' اگر مذہب غیر زبان میں ہو گا تو یہ وحدت کا باعث نہیں ہو گا' اس لئے عیسائیت اور اسلام مذاہب کی بنیاد پر قوموں کی تشکیل نہیں کر سکتے' یہودیت چونکہ ایک قومی مذہب ہے' اس لئے اس نے یہودیوں کو متحد کر لیا۔
اس لئے جب زبان کی بنیاد پر عرب قوم پرستی کی تشکیل ہوئی تو اس میں سب سے

عرب قوم پرستی

باسم طبی نے اپنی کتاب 'عرب نیشنل ازم' کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کی طرف نشان دہی کی ہے کہ دنیا میں قومیت کی بنیاد پر ریاست کا تصور ایک جدید نظریہ ہے ورنہ قدیم تاریخ میں ہمیں شہری ریاست اور قرون وسطیٰ میں عالمی ریاست' کے نظام ملتے ہیں۔ قومی ریاست کی ابتدا بھی ایک عالمی تحریک کی شکل میں پیدا ہوئی کہ جو یورپ میں ۱۶۴۸ء میں ویسٹ فیلیا کے معاہدہ سے شروع ہوئی اور دنیا میں یہ یورپی نوآبادیاتی نظام کے ذریعہ روشناس ہوئی۔ یورپ میں قرون وسطیٰ میں ریاست کا تصور سرحدی بنیادوں پر تھا' ویسٹ فیلیا کے معاہدہ کے بعد آزاد ریاست کا وجود آیا' اور فرانسیسی انقلاب نے قومی ریاست کو پیدا کیا۔

مشرق وسطیٰ میں اس وقت عثمانی خلافت قائم تھی جس کی حیثیت عالمی ریاست کی تھی لیکن جب قومی ریاست ایک مضبوط اور مقبول تحریک کی شکل میں پیدا ہوئی تو عثمانی خلافت اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی' اور اسی کے نتیجہ میں عرب نیشنل ازم پیدا ہوا۔ اس لئے عرب قوم پرستی کی تحریک اس یورپی تحریک کا ایک حصہ ہے کہ جو یورپ میں فرانسیسی انقلاب کے بعد سے شروع ہوا۔ ورنہ اس سے پہلے عرب دنیا میں قوم پرستی کی تحریک نہیں تھی' عربوں کی ابتدائی تاریخ میں جو ایرانیوں اور عربوں کے درمیان تصادم ملتا ہے' اسے نسلی کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔

جب قوم کی تشکیل ہوتی ہے تو اس وقت دو گروہ ہوتے ہیں جو کہ باعمل ہوتے ہیں ان میں سے ایک وہ گروہ ہوتا ہے کہ جو معاشرے کے مختلف گروہوں اور جماعتوں کو متحدہ کرنا چاہتا ہے' مگر ان کے ساتھ ہی وہ گروہ بھی ہوتا ہے کہ جو اس اشتراک میں اپنے مفادات کا نقصان دیکھتا ہے اور اس کے خلاف ہوتا ہے۔ مثلاً عرب دنیا میں یہ گروہ کردوں کا ہے' جو عرب قوم پرستی میں خود کو ضم نہیں کرنا چاہتے اور اپنی علیحدہ سے شناخت برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ جب بھی قوم کی تشکیل کا مرحلہ آتا ہے تو وہ گروہ جو کہ ہم آہنگی و یکجہتی چاہتے ہیں وہ دوسرے گروہوں کی ثقافتی' لسانی' اور نسلی شناخت کو ختم کر کے انہیں جبر و تشدد کے ساتھ ملنے پر مجبور کرتے ہیں۔ چنانچہ ترکی میں کردوں کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ خود کو کرد کہیں' اس کے بجائے انہیں ترک کہا جاتا ہے' انہیں اپنی زبان بولنے' اور اپنی ثقافتی سرگرمیوں کی بھی اجازت نہیں ہے۔

زیادہ حصہ عرب عیسائیوں نے لیا' کیونکہ اس صورت میں وہ مذہبی تعصبات سے بالاتر ہو کر عرب قوم میں شامل ہو گئے۔ اور اس لئے انہوں نے عربی زبان کی ترقی اور نشوونما میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیا' اور یہ وہ دور ہے کہ جس میں عربی میں تخلیقی ادب و تحقیقی علوم لکھے گئے اور زبان کو وسیع و جامع بنایا گیا۔

۱۹۶۰ء کی دہائی میں عرب قوم پرستی اپنے عروج پر تھی' جمال عبدالناصر کی سربراہی میں عرب ملکوں میں قوم پرستی کے جذبات ابھر رہے تھے۔

مگر جس عنصر نے عربی قوم پرستی کو نقصان پہنچایا وہ یہ کہ مصر' عراق' شام میں سیاسی راہنمائی فوج اور افسروں کے ہاتھ میں تھی' انہوں نے عرب قوم پرستی کو اپنے اقتدار کے طور پر استعمال کیا' اور اپنے استحکام کی خاطر اپنے مخالفوں کو سختی سے کچلا' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک پارٹی کی حکومت' پابندیوں' اور سنسرشپ کی وجہ سے جمہوری روایات و اقدار پروان نہیں چڑھ سکیں' اور اگر کوئی سیاسی تبدیلی بھی آئی تو وہ فوجی انقلاب کے ذریعہ' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے سماجی و معاشی مسائل حل ہونے کے بجائے برابر بڑھتے رہے' اور اسی لئے آگے چل کر عوام کو قوم پرستی اور اس کی لیڈرشپ سے مایوس کر دیا' اور جب قوم پرستی کمزور ہوئی تو اس کی وجہ سے ان ملکوں میں بنیاد پرستی کا احیاء ہوا۔

بنیاد پرستوں نے سب سے پہلے سیکولر قوم پرستی پر حملے کئے' اور اس پر یہ تنقید کی کہ یہ تحریک غیر ملکی امداد اور مفادات کی وجہ سے وجود میں آئی' اور اس کا قائد لارنس آف عریبا تھا' اس لئے مغرب اور صیہونیت کا مقابلہ کرنے کے لئے عربوں کو اسلام کی بنیاد پر متحد ہونا چاہئے' اور قوم پرستی سے چھٹکارا پانا چاہئے۔

عرب میں بنیاد پرستی کو اس وقت مقبولیت ملی کہ جب ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیل کے مقابلہ میں عربوں کو ناکامی ہوئی' اس کے بعد شام اور عراق میں فوجی حکومتوں نے بدترین آمریتیں قائم کر کے ترقی پسند نظریات کو ختم کر دیا' اور ان کے خاتمہ کے بعد سوائے مذہب اور بنیاد پرستی کے اور کوئی راستہ لوگوں کے لئے باقی نہیں رہا' لہٰذا اس خلا میں انہیں قدم جمانے کے موقع ملے۔ پھر ۷۰ کی دہائی میں عرب تیل کی ریاستوں نے جن میں سعودی عربیہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انہوں نے اسلامی تحریکوں کو مالی امداد دی' اور سیکولر قوم پرستی کی مخالفت کی۔

اس میں امریکی اور اسرائیل مفادات بھی تھے کہ عرب قوم پرستی کو کمزور کیا جائے' اور یہ جو ایک چیلنج کی صورت میں ابھر رہی ہے اسے روکا جائے' اس لئے عرب قوم پرستی

کے مقابلہ میں انہیں بنیاد پرستی کی زیادہ ضرورت تھی' باسم طبی کہ جس نے عرب نیشنل ازم پر یہ مطالعہ کیا ہے وہ اپنی رائے دیتے ہوئے کہتا کہ جس طرح سے پان اسلام ازم خاص سیاسی حالات میں پیدا ہوا تھا' اور وقت کے ساتھ ختم ہو گیا' یہی صورت حال اسلام کے سیاسی استعمال کی ہے' یہ لوگوں کی ضروریات اور مفادات کے نتیجہ میں پیدا نہیں ہوا ہے' بلکہ سیاسی بحران کی پیداوار ہے' اور اسی لئے اس کا یہ کردار جلدی ختم ہو جائے گا۔

اسلام کے اندر جدوجہد

رفیق ذکریا نے اپنی کتاب' اسلام کے اندر جدوجہد' میں یہ مطالعہ کیا ہے کہ جدید دور میں حالات میں تبدیلیوں' اور نئے چیلنجوں کی بنا پر اسلام کے اندر کیا تبدیلیاں آ رہی ہیں' خاص طور سے جب نوآبادیاتی دور ختم ہوا' اور اسلامی ملک آزاد ہوئے' تو ان ملکوں کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اپنی شناخت کو کس طرح سے قائم کیا جائے' شناخت کے اس مسئلہ نے کئی مسائل کو پیدا کیا' وہ یہ کہ یہ شناخت مذہب کی بنیاد پر ہو' یا قوم و نسل کی' اس کے نتیجہ میں بنیاد پرستی اور سیکولر قوتوں کے درمیان زبردست کش مکش شروع ہوئی' اور اس وقت اسلامی ملک اس بحران سے دوچار ہیں کہ اپنی شناخت کو کن بنیادوں پر استوار کریں۔

سیکولر ازم اور مذہب کے درمیان تصادم تقریباً دنیا کے تمام بڑے مذاہب میں رہا ہے' عیسائیت خصوصیت سے اس مسئلہ سے زیادہ دوچار رہی' اور اسی لئے وہاں اس بات کی کوششیں ہوئیں کہ اس مسئلہ کو کس طرح سے حل کیا جائے' پوپ گالے شس اول' نے "دو تلواروں" کا نظریہ پیش کیا' جس کے تحت روحانی طاقت پوپ کے پاس تھی جب کہ دنیاوی طاقت بادشاہ کے پاس اگرچہ محض اس نظریہ سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوا' اور پورے قرون وسطیٰ میں' یورپ میں روحانی اور دنیاوی طاقت کے درمیان اس بات پر جھگڑے ہوتے رہے کہ ان میں سے زیادہ طاقت ور کون ہے' لیکن یورپ میں جیسے جیسے سائنس و سماجی علوم میں ترقی ہوتی رہی' اسی طرح سے مذہب کمزور ہوتا رہا' یہاں سیاسی و معاشی اور سماجی حالات نے ریاست اور مذہب کو علیحدہ علیحدہ کر دیا۔ اور پھر یورپ میں سیکولر ازم کا جو نظریہ پیدا ہوا' اس کی بھی مختلف جہتیں رہیں ہیں' مثلاً یورپ کی جمہوری ریاستوں میں سیکولر ازم کا نظریہ اور ہے' اور سوشلسٹ ریاستوں میں اسے اور طرح سے دیکھا گیا اور اس پر عمل کیا گیا' روس اور دوسری سوشلسٹ جمہوریتوں میں سیکولر ازم کی شکل الحاد کی صورت میں ظاہر ہوئی کیونکہ ان ملکوں نے مذہب کو سرکاری و نجی دونوں پہلوؤں سے بالکل خارج کر دیا تھا' جب کہ یورپ کی جمہوریتوں میں مذہب سیاست میں تو دخل نہیں دیتا ہے' مگر یہ نجی زندگی میں باعمل رہتا ہے۔ ڈونالڈ یوگین نے یورپی سیکولر ازم کی جو تعریف کی ہے' اس کے مطابق سیکولر ازم وہ نظریہ ہے کہ جو فرد کو پوری پوری مذہبی آزادی دیتا ہے' کیونکہ ان شرائط کے ساتھ کے وہ دوسرے مذاہب میں دخل اندازی نہیں کرتے۔ ریاست

کا نہ تو کوئی مذہب ہوتا ہے اور نہ وہ کسی بھی مذہب کے فروغ یا تبلیغ کی کوشش کرتی ہے۔

لیکن جہاں تک اسلام کی تعلیمات کا تعلق ہے' اس میں سیکولر ازم کی چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہو کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام میں مذہب اور ریاست دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اور انہیں کسی بھی صورت میں علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے' مسلمان راہنماؤں کے سامنے یہ مسائل ہیں کہ وہ کس طرح سے جدید چیلنجوں کا سامنا کریں' اور ان مشکلات پر کیسے قابو پائیں کہ جن کے لئے اسلام میں کوئی واضح ہدایات نہیں ہیں۔ اس لئے مختلف مسلمان راہنماؤں نے علیحدہ علیحدہ راستوں کو اختیار کیا' مثلاً ترکی میں کمال اتاترک نے ترکی کی پسماندگی کا ذمہ دار مذہب کو قرار دیا' اور یہ فیصلہ کیا کہ ترکی کی ثقافت اور زندگی سے مذہبی اثرات کو بالکل مٹا دیا جائے' اور اس کی جگہ مغربی سیکولر نظام رائج کیا جائے۔ اس لئے اگر آج بھی ترکی جمہوریت و سیکولر ازم کے نظریات پر قائم ہے' مگر ساتھ میں وہاں آہستہ آہستہ بنیاد پرستی بھی ابھر رہی ہے جو کہ معاشرہ کے مسائل سے فائدہ اٹھا کر ان کا ناکامی کی ذمہ داری سیکولر ازم پر ڈال رہے ہیں۔

مشرق وسطٰی میں تھوڑے عرصہ کے لئے عربی قوم پرستی نے اسلام کو دھکیل کر پیچھے کر دیا تھا لیکن جب عرب قوم پرست راہنما نے آمرانہ رویوں کے ساتھ حکومت کرنا شروع کی' اور لوگوں کے مسائل حل کرنے میں ناکام رہے تو ان کی ان ناکامیوں پر بنیاد پرستوں نے اپنی تحریک کی داغ بیل ڈالی۔ چنانچہ الجیریا میں جو بنیاد پرستوں کو مقبولیت ملی ہے اس میں وہاں کی سوشلسٹ حکومت کی ناکامی ہے۔ یہی صورت حال مصر کی ہے کہ جہاں ساوات اور حسنی مبارک ملک کو معاشی بحران سے نکالنے میں ناکام ہو گئے' اور مایوس لوگوں کے لئے مذہب کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں چھوڑا۔ اس کے علاوہ اسرائیل کے ہاتھوں مسلسل شکستوں' امریکہ اور یورپ کے مخالفانہ رویوں نے لوگوں کو اس قدر مایوس کر دیا ہے کہ ان کے لئے سوائے مذہب کے اور کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں ہے کہ جس کے ذریعہ وہ اپنی شناخت کو ابھاریں' اور اپنے مسائل کے حل کے لئے اسے اختیار کریں ایران کے انقلاب اور تبدیلی سے انہیں اور بھی زیادہ تقویت ہوئی۔

مشرق وسطٰی کے مقابلہ میں افریقی ملکوں میں جہاں جہاں اسلام ہے' ان کے تجربات ان سے مختلف ہیں۔ مثلاً سوڈان کی مثال لیجئے' اس کو عربوں نے فتح کیا' اور فتح کے بعد ان کی زبان اور مذہب تک کو بدل ڈالا' اس کے نتیجہ میں ان کی تاریخی شناخت ختم ہو گئی' اور

اب وہ خود کو عرب اور عرب دنیا سے منسلک کئے ہوئے ہیں اور یہ ثابت کرنے کے لئے وہ خود کو زیادہ سے زیادہ مذہبی ثابت کرنا چاہتے ہیں' لیکن افریقہ کے دوسرے ملک جن میں ماریطانیہ' سینیگال' نائجیریا' نائجر' اور صومالیہ شامل ہیں یہ عربوں کے ہاتھوں فتح نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ یہاں لوگوں نے مبلغوں کے ذریعہ اپنا مذہب بدلا۔ اس لئے انہوں نے اپنی قبائلی روایات کو ترک نہیں کیا' بلکہ انہیں اسلام سے ہم آہنگ کر دیا' اس لئے ان کے ہاں مذہبی معاملات میں تشدد نہیں ہے' بلکہ قوت برداشت ہے' اس لئے نوآبادیاتی دور حکومت میں انہوں نے آسانی سے سیکولر اداروں اور روایات کو اختیار کر لیا۔

رفیق ذکریا نے اپنی کتاب میں ہندوستان کے مسلمانوں کی تصویر بڑی مایوس کن پیش کی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ ہندوستان میں جو تبدیلیاں ہو رہیں ہیں' ان سے بالکل بے خبر ہیں' اس لئے ان میں یہ صلاحیت ختم ہو رہی ہے کہ کس طرح سے ہندوستان کی سیاست اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں حصہ لیں اور اپنی موجودگی کا احساس دلائیں۔ اس کے بجائے وہ بنیاد پرستی کا سہارا لے رہے ہیں' اور عملی دنیا و زندگی سے برابر کٹ رہے ہیں۔ اس نے ہندوؤں میں جو فرقہ وارانہ تحریکیں اٹھ رہی ہیں یہ ان کے وجود کے لئے ایک بڑا خطرہ بن کر سامنے آ رہی ہیں۔ اس لئے ان سے بڑھنے اور مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سیکولر ازم کا ساتھ دیا جائے اور اس کے اداروں کو مضبوط کیا جائے' کیونکہ اگر مذہب کے ذریعہ ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی تو یہ تصادم کو اور زیادہ خون ریز بنا دے گا اور اس کے نتیجہ میں فرقہ واریت اور زیادہ پھیلے گی۔

فریڈ ہالیڈے اور حمزہ علوی نے "ریاست اور نظریہ: مشرق وسطٰی اور پاکستان میں" ان ملکوں میں ریاست کی تشکیل اور اس کے نظریہ پر مختلف اسکالرز کے مقالے جمع کئے ہیں' اور اس بات کا تجزیہ کیا ہے کہ نوآبادیات کے ختم ہونے کے بعد مشرق وسطٰی اور جنوب ایشیا کی ریاستوں میں کیا کیا تبدیلیاں آئیں' کس طرح سے وہ نئی قوموں کی شکل میں ابھریں' اور اس طرح ان نئی قوموں کو سیاسی' سماجی' اور معاشی مشکلات کا سامنا ہوا' اور وہ کن بنیادوں پر ان پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہیں۔

ان مقالات میں جن باتوں پر زور دیا گیا ہے وہ یہ کہ ان ملکوں میں جو بھی سیاسی یا معاشی تبدیلیاں آئی ہیں' وہ صرف شہروں میں آئی ہیں جب کہ دیہات ان تبدیلیوں کا مرکز نہیں رہے' انہیں شہری مرکزوں میں سیاسی و سماجی ادارے اور گروہ سرگرم عمل رہتے ہیں اور معاشرے میں تبدیلیاں لاتے رہتے ہیں۔ ان تمام ریاستوں کو آزادی کے بعد کسی نظریہ

کی ضرورت تھی کہ جس کی بنیاد پر یہ خود کو مستحکم کر سکیں اور لوگوں کی وفاداریاں حاصل کر سکیں' اس لئے ترکی میں کمال ازم' مصر میں ناصر ازم' شام اور عراق میں بعث ازم' اسرائیل میں صیہونیت' ایران میں پہلوی ازم' اور پاکستان میں اسلام ازم کو اختیار کیا گیا۔

نکی کیڈی نے اپنے مقالہ میں اس بات کی جانب نشان دہی کی ہے کہ مشرق وسطی اور جنوب ایشیا کے وہ ملک کے جو نو آبادیاتی نظام میں رہے ہیں' ان ملکوں میں مغرب کے خلاف زیادہ نفرت اور پروپیگنڈا ہے' بہ نسبت ان ملکوں کے کہ جو آزاد رہے' اور کسی مغربی طاقت کے زیر اثر نہیں رہے۔ مغربی نفرت کے نتیجہ میں ان ملکوں میں اسلام ایسے نظریہ اور نظام کی شکل میں ابھر رہا ہے کہ جو انہیں نہ صرف شناخت فراہم کرتا ہے۔ بلکہ مغرب سے جدوجہد کرنے کے ہتھیار بھی فراہم کرتا ہے۔

کیڈی' آج کل کی مقبول عام اصطلاح بنیاد پرستی کے بجائے اسلام ازم کی اصطلاح کو استعمال کرنا زیادہ پسند کرتی ہے۔ اس نے اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اسلام بحیثیت مذہب اور نظریہ کے ہر مسلمان ملک میں مختلف ہے۔ اور اس کی اس تبدیلی میں اس ملک کے سیاسی' معاشی' سماجی اور جغرافیائی حالات و ماحول کو بڑا دخل ہے' مثلاً سینیگال اور سماترا میں اسلام بڑا نرم مزاج اور قوت برداشت کا حامل ہے۔ نائجیریا اور ملیشیا میں کہ جہاں کئی مذاہب اور اقوام رہتی ہیں' وہاں بھی یہ پر تشدد نہیں ہے۔ جب کہ مصر' شام' سوڈان' ایران' اور پاکستان میں اس کی شکل بڑی انتہا پسندی کی ہے' اور یہ اسلام کے سوا اور تمام نظریات کی نفی کرتے ہیں۔

فریڈ ہالی ڈے' نے اپنے آرٹیکل جو ایران کے انقلاب پر ہے' اس کا تجزیہ کیا ہے کہ یہ پہلا انقلاب ہے کہ جو مذہب کی بنیاد پر لایا گیا' اور اس کی جو اہم خصوصیات ہیں وہ یہ ہیں: یہ تمام تاریخی ترقیوں کے خلاف ہے' انہیں رد کرتا ہے' اور معاشرہ کو واپس ماضی میں پہنچانا چاہتا ہے۔ یہ قوم پرستی کے نظریہ کے خلاف ہے' اور مذہب کی عالمی بنیادوں کا حامی ہے۔ یہ جمہوریت کے بھی خلاف ہے' اور اس میں تمام اقتدار مذہبی راہنما فقیہ کے ہاتھوں میں ہے۔

ایرانی انقلاب جن باتوں کی وجہ سے دوسرے انقلابوں سے مختلف ہے' وہ ہیں: یہ ایک ایسے معاشرہ میں آیا ہے کہ جو سماجی و معاشی لحاظ سے ترقی یافتہ تھا' یعنی روسی اور چینی معاشروں کے مقابلہ میں زیادہ آگے تھا۔ انقلاب کا مرکز شہر رہے' جب کہ چینی' کیوبا' اور ویٹ نام کے انقلابات دیہاتوں میں آئے' اور وہاں سے یہ شہروں میں منتقل ہوئے۔ اس

نے شہنشاہیت یا قدیم نظام کو اسٹرائکس اور مظاہروں کے ذریعہ ختم کیا' مسلح انقلاب کے ذریعہ نہیں۔ اور اس کی کامیابی میں کسی غیر ملکی طاقت کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔

ایران' ایرانی انقلاب کے بعد کس حد تک اپنے مسائل کو حل کر پائے گا۔ اس کا جواب آنے والے حالات پر ہے' کیونکہ اب تک نعروں اور جذبات کے ذریعہ اس نے لوگوں کو قابو میں رکھا ہے' مگر آہستہ آہستہ محض مغرب کے خلاف' اور ہمسایہ ملکوں کے خلاف نفرتوں سے لوگوں کو وفادار نہیں رکھا جا سکے گا' اس لئے ایران کی نئی لیڈرشپ اب اس بات کی کوشش کر رہی ہے کہ علماء کے اثر درسوخ کو کم کیا جائے' اور ایران کو جو مسائل درپیش ہیں ان کو حقیقت پسندی کے ساتھ حل کیا جائے' اگر رفسنجانی کی حکومت اس میں کامیاب ہوتی ہے تو ایران میں تبدیلی آ سکتی ہے' ورنہ وہاں حالات اور زیادہ خراب ہوں گے' اور اس کے نتیجہ میں اور زیادہ انتشار پھیلے گا۔

عربوں کے معاشرے میں رنگ و نسل

برنارڈلوئس برطانوی مستشرق ہے کہ جس نے اسلامی تاریخ اور تمدن پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں "اسماعیلیوں کی ابتداء" اور "مسلمان اور یورپ کی دریافت" مشہور ہیں' انہوں نے اپنی تازہ تصنیف "مشرق وسطی میں نسل اور غلامی" میں اسلامی معاشرہ میں ان تعصبات پر روشنی ڈالی ہے کہ جو وقت کے ساتھ ساتھ نسل اور غلامی کے سلسلہ میں اختیار کئے گئے۔ یہ تعصبات ہمیشہ ایک سے نہیں رہے بلکہ ان میں تبدیلی آتی رہی' مثلاً جب اسلام سے پہلے ایرانیوں نے عرب کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا' تو اس کے نتیجہ میں وہ خود کو عربوں سے اعلیٰ و برتر سمجھنے لگے تھے' لیکن جب اسلام لانے کے بعد عربوں نے ایران فتح کر لیا اور ایرانیوں کو شکستیں دیں تو ان کا برتری کا مقام ختم ہو گیا اور اب عرب خود کو اعلیٰ و افضل سمجھنے لگے۔

عربوں میں جب تک معاشرہ قبائل میں تقسیم تھا۔ اس وقت تک ان میں رنگ اور نسل کی بنا پر کسی سے تعصب نہیں برتا جاتا تھا' اور اسلام نے بھی مساوات پر زور دیا ہے اور نسلی تفخر کو برا کہا ہے۔ لیکن عملی طور پر یہ ہوا کہ جب عرب قبائلی متحدہ ہوئے اور ایک قوم کی شکل اختیار کی اور دوسری قوموں کو شکستیں دے کر ان کے علاقوں پر قبضہ کیا تو انہوں نے عربوں اور غیر عربوں کی تخصیص قائم کی' اور عرب معاشرہ میں ایک طبقہ پیدا ہوا کہ جو غیر عرب تھے مگر مسلمان بھی تھے۔ یہ لوگ "مولا" کہلائے۔

چونکہ مولا کے طبقہ کو عرب معاشرہ میں باعزت مقام نہیں ملا' اس لئے یہ لوگ ریاست اور معاشرے کے خلاف سازشوں' اور بغاوتوں میں مصروف رہے' اور جب عباسیوں نے امیوں کے خلاف مسلح بغاوت کی تو اس میں غیر عرب پیش پیش تھے اور اسی لئے عباسی دور میں پہلی مرتبہ ایران و عرب برابر اور مساوی طور پر ایک ہوئے اور ان میں جو نسلی تفریق تھی وہ ختم ہوئی۔ لیکن اس کے ختم ہوتے ہوتے ایک اور تفریق پیدا ہوئی کہ جو رنگ کی بنیادوں پر تھی۔

اگرچہ عربوں میں اسلام سے پہلے حبشی نسل کے لوگ تھے' اور اسلام میں ان لوگوں کو برابر کا مقام دیا گیا تھا' لیکن افریقی ممالک کی فتوحات کے بعد جب حبشی لوگوں کو غلام بنا کر ان کی تجارت شروع ہو گئی تو ان کے خلاف تعصب کی جڑیں گہری ہو گئیں۔ ابن قتیبہ (وفات ۸۸۹)' عربی کا ایک مشہور ادیب ان لوگوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہ بدصورت

اور بے ڈول مخلوق ہے' کیونکہ یہ گرم ملکوں میں رہتے ہیں' اس لئے گرمی کی وجہ سے یہ رحم مادر میں زیادہ پک جاتے ہیں اور ان کے بال گھنگریالے ہو جاتے ہیں۔ ابن خلدون' کے حبشی لوگوں کے بارے میں اس قسم کے خیالات تھے کہ یہ فطری طور پر غلامی کو پسند کرتے ہیں اور اطاعت گذار ہیں' ان میں انسانی خوبیاں اور اوصاف بہت کم ہیں اور یہ گونگے جانوروں کی مانند ہیں۔

جب عربوں نے ان ملکوں کو فتح کیا کہ جہاں کے لوگوں کا رنگ صاف تھا تو اس کے نتیجہ میں کالے لوگوں کا سماجی مقام اور بھی گر گیا۔ مثلاً وہ غلام کہ جن کا رنگ صاف اور گورا ہوتا وہ مملوک کہلاتے تھے۔ حبشی لوگوں کے لئے عبد کا لفظ استعمال ہوتا تھا' اور اکثر ان لوگوں سے گھریلو کام کاج کرائے جاتے تھے' جب کہ گورے رنگ والوں کو اعلیٰ عہدے دیئے جاتے تھے' فوج اور انتظامیہ میں اس وجہ سے ان کا اثر و رسوخ بڑھا ہوا تھا۔

بعد میں جب مسلمان خاندانوں میں اندرونی طور پر کمزوریاں آئیں' تو انہوں نے اپنے غلاموں پر مشتمل فوجوں کے ذریعہ اپنے اقتدار کو مستحکم کیا' اس لئے نویں صدی عیسوی میں اس قسم کی غلاموں کی فوجیں مسلمان ملکوں میں قائم ہونا شروع ہو گئیں۔ کیونکہ غلاموں پر مشتمل فوجیں اپنے حکمراں کی وفادار ہوتی تھیں' اور اس کے احکامات کی تعمیل میں سازشوں اور بغاوتوں کا خاتمہ کرتی تھیں۔ لیکن جب انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ ان کی طاقت و قوت کی وجہ سے بادشاہ اور اس کا خاندان حکمراں ہے تو انہوں نے بادشاہ کو کٹھ پتلی بنا کر اصل طاقت خود اختیار کر لی' اور کئی صورتوں میں حکمراں خاندانوں کو ہٹا کر ان کی جگہ اپنی حکومت قائم کر لی' جیسا کہ مصر میں مملوک خاندان' اور ہندوستان میں خاندان غلاماں۔

مسلمان ملکوں میں سفید رنگ کے غلاموں کی مانگ بہت زیادہ تھی' اس میں اس وقت کمی آئی جب کہ اٹھارویں صدی میں روس نے مشرقی یورپ میں اپنا اقتدار قائم کر لیا' اور پھر کوہ قاف کے علاقوں اور کریمیا میں ان کی حکومت قائم ہو گئی۔ اس لئے سفید رنگ کے غلاموں کی جگہ حبشی غلاموں نے لے لی۔ انیسویں صدی میں یورپ میں غلامی کے خلاف مہم کا آغاز ہوا' لیکن اسلامی ملکوں میں حکمرانوں اور علماء نے اس کی مخالف کی۔ مثلاً حجاز کے شیخ جمالی نے اسے اسلامی قوانین کے خلاف قرار دیا' لیکن چونکہ دنیا بھر میں اس کی سخت مخالفت تھی اس لئے مسلمان ملکوں کو بھی آہستہ آہستہ غلامی ختم کرنا پڑی' اور ۱۹۶۲ء میں یمن میں اس کا خاتمہ ہوا' جب کہ موریطانیہ میں یہ ۱۹۸۰ء تک تھی۔

اس مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اگرچہ اسلامی تعلیمات میں رنگ و نسل کی

بنیاد پر ہر قسم کے تعصب کی مذمت کی گئی ہے' لیکن عملی طور پر مسلمان معاشرے میں یہ تعصبات قائم رہے' اور پوری تاریخ میں ان بنیادوں پر سماجی رتبہ متعین ہوا اس لئے برنارڈلو س کے الفاظ میں' ان غلطیوں کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ جن غلطیوں سے ہمارے سیاسی جذبات کو تسکین ملتی ہے' کیونکہ ان غلطیوں کی نشان دہی اور ان کے اقرار کے بعد ہی ہم معاشرے کی اصلاح کر سکتے ہیں' اور اس میں جو تعصبات ہیں انہیں دور کر سکتے ہیں۔

بپن چندر اور ہندوستان کی قومی آزادی

بپن چندر ہندوستان کے ان مورخوں میں سے ہیں کہ جنہوں نے تاریخ کو ایک وسیع نقطہ نظر سے پیش کیا ہے۔ خاص طور سے وہ ہندوستان کی تاریخ کے نو آبادیاتی' سامراجی برطانوی دور حکومت' اور ان کے خلاف ہونیوالی تحریک آزادی کے ماہرین میں سے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں "کمیونزم ان ماڈرن انڈیا" نیشنل ازم اینڈ کلونیل ازم ان ماڈرن انڈیا' اور رائز اینڈ گروتھ آف اکنامک نیشنل ازم' خاص طور سے مشہور ہیں۔ یہاں ان کی ایک مختصر کتاب' انڈین نیشنل مومینٹ کے بارے میں تبصرہ کیا جاتا ہے۔

پاکستان میں انگریزوں کے خلاف جدوجہد آزادی کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک کش مکش اور تصادم کی تاریخ سمجھا جاتا ہے۔ اور اسے ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان جنگ آزادی نہیں سمجھا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس نقطہ نظر کی وجہ سے ہم نوآبادیاتی دور اس کے استحصال' اور اس کی خرابیوں سے بے خبر رہتے ہیں' اور جدوجہد آزادی اور ہمہ جہت سرگرمیوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ بپن چندر نے اپنی اس کتاب میں انگریزی حکومت کے خلاف جدوجہد کی تاریخ پیش کرتے ہوئے اس کے اہم منصوبوں' نظریات' حربوں اور راہنماؤں اور عوام کے درمیان تعلقات کو بیان کیا ہے۔

بپن چندر اس بات کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں سب سے بڑا حصہ معاشی استحصال کا ہے کہ برطانوی حکومت نے کس طرح سے عوام پر زیادہ سے زیادہ ٹیکس عائد کئے۔ انگریزی نژاد باشندوں کو ہندوستان میں ملازمتیں دے کر ان کی خطیر تنخواہیں مقرر کیں' برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان غیر مساوی تجارت کو فروغ دیا۔ اور برطانوی سرمایہ کو ہندوستان میں لگا کر خوب منافع کمایا' ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرہ کے ہر طبقہ میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف جذبات ابھرنا شروع ہوئے' اور ان باتوں کے ساتھ ساتھ ان کے سماجی مسائل' اور سیاسی خواہشات نے اس تحریک میں مزید جان ڈالدی' کیونکہ جدوجہد آزادی میں جن باتوں پر زور دیا گیا وہ جمہوری و سیکولر معاشرے کا قیام' اور آزادی رائے' تحریر و تقریر' تھیں جو کہ معاشرے کے ہر شخص کے لئے دلچسپی کا باعث تھیں۔

تحریک کے راہنماؤں نے خاص طور پر اس بات کی کوشش کی کہ امپیریل ازم کے

کردار اور اس کے استحصال کو واضح کریں' اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برطانوی امپیریل ازم اور برطانوی عوام دو علیحدہ علیحدہ عوامل ہیں' اسلئے امپیریل ازم پر تنقید کی جائے مگر برطانوی عوام کو برا نہیں کہا جائے۔ ان کی اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی معاشرہ کے لبرل لوگ اور ان کی ہمدردیاں تحریک کے ساتھ ہو گئیں۔

تحریک کے راہنماؤں نے دنیا کے مختلف ملکوں میں اٹھنے والی انقلابی اور آزادی کی تحریکوں کی حمایت کی۔ جب یورپ میں فاشزم ابھرا اور طاقتور ہونا شروع ہوا تو اس کی ہندوستان کے راہنماؤں کی طرف سے بھرپور مخالفت کی گئی۔ اس کے علاوہ تحریک آزادی نے غریبوں کی ہمدردی' عورتوں کی آزادی اور اچھوت لوگوں کے حقوق کی آواز اٹھائی۔ ان سب باتوں کی وجہ سے ہندوستان کی قومی تحریک آزادی ایک وسیع اور ہمہ گیر شکل میں ابھری کہ جس میں ہر طبقہ اور کلاس کے لوگوں نے دلچسپی لی' اور تحریک میں عملی طور پر حصہ لیا۔

تحریک کے راہنماؤں نے اس بات کی کوشش کی کہ نوآبادیاتی حکومت کے کردار کو اچھی طرح سمجھا جائے کیونکہ اس صورت میں ان کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ اس کے خلاف موثر جدوجہد کر سکیں۔ نوآبادیاتی حکومت کے دو اہم پہلو تھے : ایک تو اس کا روشن خیال جس کے تحت اس نے اس بات کی اجازت دی تھی کہ لوگ قانونی طور پر اپنے حقوق کے لئے لڑ سکیں۔ اور قانون کی بالادستی کو استعمال کر سکیں۔ دوسری طرف برطانوی حکومت نے اپنی قوت و طاقت' اور دہشت کو لوگوں کے دلوں پر بٹھا رکھا تھا اور لوگوں میں یہ خیال عام تھا کہ حکومت کو شکست دینا' اور اس کے خلاف جدوجہد کرنا بیکار ہے' اس طرح نوآبادیاتی نظام روشن خیالی اور استحصالی دونوں پہلو رکھتا تھے۔

جب گاندھی نے قومی تحریک آزادی کی راہنمائی اختیار کی تو اس نے نوآبادیاتی نظام کے خلاف لڑنے کے لئے عدم تشدد کی پالیسی کو اختیار کیا' دیکھا جائے تو اس قسم کا رویہ صرف برطانوی حکومت میں ہی اختیار کیا جا سکتا تھا' کیونکہ ان کی حکومت میں شہریوں کے حقوق کی ضمانت تھی' اور قانون کا احترام تھا' اگر اس قسم کی پالیسی زار روس یا جرمنی کے ہٹلر کے خلاف استعمال ہوتی تو وہ جبر و تشدد اور طاقت سے اسے کچل کر رکھ دیتے۔ لیکن چونکہ لوگوں کو احساس تھا کہ برطانوی حکومت میں انہیں یہ حق ہے اور ان کے حق کی قانونی حیثیت ہے اس لئے لوگ اس میں شامل ہوئے اور انہیں کسی قسم کا ڈر یا خوف محسوس نہیں ہوا۔

اسی لئے جب راہنماؤں نے یہ اندازہ لگایا کہ لوگ ان کے ساتھ آنے پر ذہنی طور پر تیار ہیں۔ تو انہوں نے لوگوں کو متحرک کرنے کے لئے جلسے' جلوس' مظاہرے' اسٹرائک' کے طریقوں کو استعمال کیا' اور عدم تعاون کی تحریک سے لے کر کھادی کے لباس کو اختیار کرنے کے طریقوں سے لوگوں میں ایک نیا جذبہ اور جوش پیدا کیا۔ تحریک نے جس حکمت عملی کو اختیار کیا اس کو گرامچی کے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ برطانوی حکومت کے خلاف لڑنے کے لئے طویل جنگ کی تیاری کی گئی' اور کوشش کی گئی کہ ہر جماعت و طبقہ کے لوگوں کو اس میں شامل کیا جائے تاکہ تحریک کا دائرہ وسیع ہو جائے۔

اس جنگ میں جو موثر حربہ اختیار کیا گیا وہ جدوجہد' صلح' جدوجہد کا تھا' اس کے پیچھے جو فلسفہ تھا وہ یہ کہ عوام کوئی بھی جنگ مسلسل نہیں لڑ سکتے' انہیں امن' آرام اور سانس لینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تاکہ وہ اپنی توانائی کو دوبارہ سے جمع کر کے جدوجہد میں اور موثر طریقہ سے شامل ہوں۔ مسلسل جدوجہد میں یہ اندیشہ بھی رہتا ہے کہ ریاست یا حکومت نروس ہو کر تشدد پر آمادہ ہو جائے اور سختی کے ساتھ تحریک کو کچل کر رکھ دے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ جب حکومت یا تحریک اس مرحلہ پر پہنچ جائے تو اس وقت اسے رک جانا چاہئے۔ اور تھوڑے عرصہ بعد پھر قوت و طاقت کو بحال کر کے جدوجہد کو آگے بڑھانا چاہئے۔ اس لئے یہ ضروری تھا کہ صرف کسی ایک مرحلہ پر لوگوں کی تمام قوت کو استعمال کر کے ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ اس لئے گاندھی نے گرامچی کے طریقہ پر عمل کرتے ہوئے یہ نہیں کیا کہ تمام قوت کو جمع کر کے قلعہ پر حملہ کرتے بلکہ اس کے برعکس یہ کیا کہ اس پر حملہ سے پہلے اس کا محاصرہ کیا جائے' اور پھر آہستہ آہستہ اس محاصرہ کو تنگ کیا جائے یہاں تک کہ قلعہ خود بخود ہتھیار ڈال دے۔ بپن چندر کے الفاظ میں گاندھی کے ان ناقدوں نے کہ جنہوں نے اس کی اس حکمت عملی کو نہیں سمجھا' جدوجہد' صلح' جدوجہد پوری طرح سے سمجھ میں نہیں آئی۔ اور انہوں نے اسے کبھی طبقاتی جنگ سے غداری سمجھا کبھی قومی جدوجہد سے غداری' کبھی امپیریل ازم سے تعاون' کبھی اعصابی کمزوری اور کبھی اخلاقی دیوالیہ پن۔

اس کے برعکس گاندھی اور اس کے ساتھیوں نے اس بات کی کوشش کی کہ لوگوں کے جذبات احساسات' امنگوں' اور امیدوں کو پوری طرح سمجھا جائے' اور تحریک کو محض اپنی مرضی و خواہش کے تابع نہیں بنایا جائے بلکہ یہ دیکھا جائے کہ لوگ کس حد تک ان کے ساتھ مل سکتے ہیں۔ گاندھی نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "میرا لوگوں پر ایک حد تک اثر

ہے اور اس میں قابل ہوں کہ ان کے مسائل کو حل کر سکوں۔ مگر اس کے لئے لوگوں کا ذہنی طور پر تیار ہونا ضروری ہے۔ میں قطعی یہ نہیں کر سکتا کہ لوگوں کی توانائیاں ان مسائل پر استعمال کر سکوں کہ جن میں انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہو۔"

قومی تحریک آزادی نے اس بات پر بھی زور دیا کہ اول نوآبادیاتی نظام سے جنگ لڑی جائے اور اس سے آزادی حاصل کی جائے اس لئے تحریک نے کسی خاص نظریہ کو اختیار نہیں کیا۔ اور کوشش کی کہ تمام نظریاتی جماعتوں اور افراد کے ساتھ سمجھوتہ کیا جائے اور انہیں ساتھ میں ملا کر رکھا جائے۔ تاکہ پہلے نوآبادیاتی نظام اور امپیریل ازم کا خاتمہ کیا جا سکے۔ کیونکہ دوسری صورت میں تحریک کا اتحاد ٹوٹ جائے گا اور نظریاتی بنیادوں پر تقسیم ہو کر جماعتیں آپس میں لڑنے لگیں گی۔

بپن چندر کے نظریہ کے مطابق برصغیر کی تقسیم کے بعد ہندوستان کو جو سیاسی ڈھانچہ ملا وہ وسیع اور جامع تھا اور اس میں اس بات کی گنجائش تھی کہ جس میں تمام جماعتوں کو برداشت کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے جمہوری اور سیکولر ہندوستان میں مختلف مذاہب اور نظریاتی جماعتوں کو آزادی ہے کہ اپنے آئیڈیل کو قائم رکھتے ہوئے اپنے وجود کو برقرار رکھیں۔

ماڈرن انڈیا

پاکستان میں تاریخ پر جو نصاب کی کتابیں لکھی گئی ہیں' ان میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ تایخ کو محض ہندو' مسلمان تصادم کی شکل میں دکھایا جائے' اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ تاریخ کے بارے میں ہمارے طالب علموں کا علم محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ نصاب کی کتابوں کی اہمیت اس سے ہوتی ہے کہ یہ طالب علموں کی اکثریت کے لئے صرف واحد ذریعہ ہوتی ہیں کہ جن کی مدد سے وہ علم حاصل کرتے ہیں اور ان کتابوں میں جو بھی معلومات دی جاتی ہیں۔ انہیں کی بنیاد پر ان کا ذہن بنتا ہے اور ان کی سوچ پروان چڑھتی ہے۔ کیونکہ ان میں اکثریت کو زندگی کی مصروفیات میں کچھ اور پڑھنے کا موقع نہیں ملتا اور علم میں جو ترقی ہوئی ہے یا جو نئی دریافتیں ہوئی ہیں۔ ان سے وہ بے خبر رہتے ہیں اسی وجہ سے ترقی یافتہ معاشرہ میں نصاب کی کتابوں کی تیاری پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی ہے' اور اس مقصد کے لئے مضمون کے ماہرین سے کہا جاتا ہے کہ وہ نصاب کی کتابوں کی تیاری میں مدد دیں تاکہ جدید تحقیق کے ذریعہ جو اضافے ہوئے ہیں وہ سب ان کتابوں میں آسکیں۔ اگرچہ نصاب کی کتابوں پر توجہ تو ہمارے ہاں بھی دی جاتی ہے' مگر اس کا مقصد یہ ہوتا ہے

کہ نظریہ پاکستان کے خلاف کوئی مواد نہیں آنا چاہئے۔ اور صرف انہیں معلومات کو دینا چاہئے کہ جو ہمارے حکمراں طبقوں کے مفادات کو پورا کرتے ہوں۔

خاص طور سے نظریاتی ملکوں میں تاریخ بہت زیادہ نقصان اٹھاتی ہے' کیونکہ ان ملکوں میں تاریخ کو ریاست کی نگرانی میں لکھوایا جاتا ہے' اور اس میں حکومت کی ماضی کی غلطیوں پر پردہ ڈال کر ان کے ہر عمل کو صحیح ثابت کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تاریخ حقائق سے پردہ اٹھانے کی بجائے ان پر پردہ ڈالتی ہے۔

سماجی علوم میں تاریخ ایک ایسا علم ہے کہ جس میں واقعات و حقائق کو کئی انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے' اس سلسلہ میں برصغیر ہندوستان کی تاریخ کی مثال ہے' کہ جس پر کئی غیر ملکی حکمراں خاندانوں اور اقوام نے حکومت کی' جن میں سے کہ آخری انگریز تھے' اس لئے جب اسکی تاریخ کو لکھا جاتا ہے تو اس میں کئی نقطہائے نظر آجاتے ہیں۔

مثلاً ان میں ایک تاریخ کا نوآبادیاتی نقطہ نظر ہے' کہ جس کے تحت وہ برطانوی اقتدار سے قبل کی تاریخ کو منفی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں تاریخ کا قومی نقطہ نظر وجود میں آیا کہ جو نوآبادیاتی دور کو مکمل طور پر رد کر دیتا ہے۔ اور اس میں کسی قسم کے مثبت پہلو نہیں دیکھتا' ان دو کے مقابلہ میں تاریخ کا ایک اور نقطہ نظر ہے کہ جس میں تاریخ کے عمل کو معروضی طور سے دیکھا گیا ہے تاکہ تاریخی واقعات کو بغیر کسی تعصب کے جانچا اور پرکھا جا سکے۔

بپن چندر کا تعلق بھی اس مکتبہ فکر سے ہے' اور اس کا اظہار ان کی اس کتاب سے ہوتا ہے کہ جو انہوں نے ہندوستان کی تاریخ پر بطور نصاب لکھی ہے۔ اور اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اب تک اس کے گیارہ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں صرف سیاسی واقعات اور ان کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے اثرات کو ہی نہیں دیکھا گیا ہے بلکہ سیاسی عمل کے ساتھ ساتھ سماجی' معاشی تحریکوں اور نظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کا تجزیہ کیا گیا ہے کہ ان کے اثرات عوام کی زندگی پر کیا ہوئے۔ اس کتاب میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس پس منظر اور عوامل پر روشنی ڈالی جائے کہ جن کی وجہ سے انگریزوں کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ ہندوستان پر قابض ہو گئے۔

مثلاً جب مغل خاندان کمزور ہونا شروع ہوا' اور اس کے نتیجہ میں خود مختار ریاستیں وجود میں آنا شروع ہوئیں۔ تو ان کی باہمی رقابتوں' خانہ جنگیوں اور کش مکش نے یورپی

طاقتوں کو یہ مواقع فراہم کئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ان کے معاملات میں دخل دیں اور اس طرح سے اپنے اثر و رسوخ کو ہندوستان کی سیاست میں پھیلائیں۔ ان حالات میں سب سے زیادہ فائدہ انگریزوں نے اٹھایا' اور اس بات کی کوشش کی کہ اس طرح زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھی کریں' چنانچہ انہوں نے انتہائی ظالمانہ طریقوں' سازشوں' اور دھوکہ دہی و فریب بازیوں کے ذریعہ ہندوستان کے ذرائع کا استحصال کیا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس مرحلہ پر ان کو اس بات کا یقین نہیں تھا کہ وہ مستقل طور پر ہندوستان کے حکمران بن سکیں گے۔ اس لئے وہ وقتی طور پر حالات سے فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ دولت کما کر انگلستان واپس جانے کے خواہش مند تھے۔ لیکن جب حالات نے انہیں اس بات کے مواقع دے کہ وہ ہندوستان پر اپنے اقتدار کو مستحکم کر سکیں' تو انہوں نے فوراً اپنی پالیسی ترک کر دی' اور ہندوستان کو جدید خطوں پر استوار کرتے ہوئے اس کے سیاسی' سماجی' معاشی اور قانونی ڈھانچوں کو آہستہ آہستہ بدل دیا۔ اور مختلف مرحلوں میں اصلاحات نافذ کر کے اپنے اقتدار کو مضبوط کر لیا۔

برطانوی اقتدار اور ان کی اصلاحات کے اثرات سب سے پہلے بنگال میں محسوس کئے گئے اور وہاں ہندوستانیوں کی جانب سے ایسی اصلاحی تحریکوں کا آغاز ہوا کہ جس کے ذریعہ ماضی کی فرسودہ روایات سے چھٹکارا پانے کی کوششیں ہوئیں تاکہ ہندوستان کو پس ماندگی سے نکالا جائے اور جدید روایات سے روشناس کرایا جائے۔ راجہ رام موہن رائے ان میں سے تھا کہ جس نے ہندو معاشرہ کی اصلاح شروع کی' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد بنگالیوں نے اس بات کو محسوس کر لیا کہ ترقی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ماضی کی ایسی روایات کو بدلیں کہ جنہوں نے ان کے معاشرہ کی ترقی کو روک رکھا ہے۔

اس کے مقابلے میں شمالی ہندوستان کا ردعمل دوسری شکل میں ہوا۔ انہوں نے مغربی نظریات کو اختیار کرنے اور معاشرے کی اصلاح کے بجائے انگریزی اقتدار کے خلاف ہتھیار اٹھائے جس کا نتیجہ ۱۸۵۷ء کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس بغاوت کو سختی کے ساتھ کچل دیا گیا کیونکہ ہندوستان کے دوسرے حصوں نے ان کا پوری طرح ساتھ نہیں دیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد' انگریزوں کی پالیسی میں زبردست تبدیلی آئی' اب تک وہ جو اصلاحات کر رہے تھے۔ اور ہندوستان کو جدید بنانے کا جو عمل تھا' اس کو انہوں نے چھوڑ دیا بلکہ اس کی جگہ انہوں نے ریاست کے اداروں کو اور زیادہ یورپی بنا دیا۔ اس کے بعد سے ان کا رویہ بھی ہندوستانیوں کے خلاف ہو گیا' اور وہ انہیں غدار' نااہل' سست و کاہل' اور

بدعنوان سمجھنے لگے۔ اب حکومت کرنے کے لئے انہوں نے ہندوستان کے زمینداروں اور جاگیرداروں سے تعاون کرنا شروع کر دیا۔ اور ان کے رویہ سے نسلی تفخر زیادہ سے زیادہ نمایاں ہونے لگا۔

اہل ہندوستان نے نوآبادیات کے اثرات کو اس وقت محسوس کرنا شروع کیا کہ جب انگلستان میں صنعتی انقلاب آیا' اور انہوں نے اپنی پیداوار کی کھپت کے لئے ہندوستان کی صنعتوں کو تباہ کرنا شروع کیا۔ خصوصیت سے کپڑے کی صنعت' جو انگلستان کی صنعتی ترقی کے سامنے نہیں ٹھہر سکی۔ اس کے نتیجہ میں صنعتی دست کار' اور ہنر مند بڑی تعداد میں بے روز گار ہو گئے اور اس بات پر مجبور ہوئے کہ عام مزدوروں کی حیثیت سے شہروں میں آ کر فیکٹریوں میں کام کریں یا انگلستان کی افریقی و ایشیائی نوآبادیات میں بطور مزدور اپنی روزی کمائیں۔ ایک طرف جہاں عام لوگوں کی تعداد بے روز گار ہو رہی تھی۔ وہاں یورپی تعلیم یافتہ متوسط طبقہ پیدا ہو رہا تھا۔ جو نوآبادیاتی نظام اور اس کے استحصال سے آگاہ ہو رہے تھے اور یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ حکومت کے معاملات و اختیارات میں انہیں بھی برابر کا حصہ دیا جائے۔ اس پس منظر میں ہندوستان میں قومی تحریک آزادی کی ابتدا ہوئی اور ۱۸۸۵ء میں کانگریس پارٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ اس مرحلہ پر ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ میں نوآبادیاتی نظام کے لئے استحصالی پہلو پوری طرح سامنے آ گئے تھے' اور وہ دیکھ رہے تھے کہ اس کے نتیجہ میں کس طرح سے ہندوستان کے ذرائع کا نوآبادیاتی نظام میں استحصال ہو رہا ہے۔ اس لئے انہیں اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ ہندوستان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا کہ جب تک وہ معاشی استحصال سے آزاد نہیں ہو گا۔ اور اپنے معاشی ذرائع کو خود اپنے لئے استعمال نہیں کرے گا۔

ہندوستان کی قومی آزادی کی تحریک کئی مرحلوں سے گزری۔ اس کے پہلے مرحلہ میں ان کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے معاشرے کی اصلاح کی جائے اور لوگوں کو توہمات' جہالت' اور فرسودہ نظریات سے نجات دلائی جائے۔ اس کے نتیجہ میں ہندوؤں' مسلمانوں' سکھوں اور پارسیوں میں احیاء کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں قومی آزادی کی تحریک پرتشدد ہو گئی۔ اور حکومت سے حقوق حاصل کرنے کے لئے انہوں نے دہشت گردی کے حربوں کو اختیار کیا۔ قومی آزادی کی تحریک اس وقت اور پرتشدد ہو گئی کہ جب حکومت نے ۱۹۰۵ء میں بنگال کو تقسیم کر دیا' اس کے نتیجہ میں حکومت پر دباؤ ڈالنے کی غرض سے حکومت کی عمارتوں پر بم پھینکے گئے۔ اور قتل کی وارداتوں میں اضافہ ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی حکومت پر مزید دباؤ ڈالنے کی غرض سے سودیشی تحریک کا آغاز ہوا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ برطانوی مال کا بائکاٹ کیاجائے اور دیسی اشیاء کا استعمال کیا جائے۔ جب حکومت نے اس کے خلاف اقدامات کئے تو اس کے نتیجہ میں انڈرگراؤنڈ سرگرمیاں زیادہ بڑھ گئیں۔ اور انہوں نے انقلابی حربوں کو اختیار کرتے ہوئے، مسلح بغاوت کے ذریعہ حکومت کو ختم کرنا چاہا۔

اس کے ساتھ ہی ملک کی سیاست میں جو تبدیلی آئی وہ یہ تھی کہ تقسیم بنگال اور پھر ۱۹۱۱ء میں اس کے خاتمہ نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرقہ وارانہ جذبات کو پیدا کر دیا اور اس کے نتیجہ میں ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام وجود میں آیا۔ جس کے ذریعہ مسلمانوں نے اس تحریک کو شروع کیا کہ ان کے حقوق علیحدہ سے ملنے چاہئے۔ اس کے نتیجہ میں آگے چل کر ہندوستان کی تقسیم ہوئی۔

ماڈرن انڈیا میں نیشنل ازم اور کلونیل ازم

اس کتاب میں بپن چندر نے ان اثرات کا تجزیہ کیا ہے کہ جو برطانوی عہد میں نوآبادیاتی نظام کے نتیجہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اس عہد کو سامراجی اور قومی نقطہائے نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اور دونوں اس بات کو کوشش کرتے ہیں کہ اپنے اپنے حق میں پرزور دلائل دیں۔ مثلاً سامراجی مورخوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت نہیں ہوتی۔ اور وہ اسے جدید خطوط پر نہیں لاتے تو ہندوستان قرون وسطی میں رہتا اور یہاں کوئی ترقی نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہندوستان کا سیاسی سماجی اور معاشی نظام انتہائی فرسودہ روایات کا حامل تھا۔ ذات پات کی تقسیم، بڑے بڑے خاندان، توہمات و اندھے عقائد، آبادی کی کثرت، سیاسی افراتفری، جائیداد و جان و مال کو خطرات اس کے اہم مسائل تھے اس لئے اس صورت میں ہندوستان میں کسی قسم کی ترقی ناممکن تھی۔

ہندوستان کی سیاسی ترقی بھی صرف اسی وجہ سے ممکن ہو سکی کہ یہاں برطانوی سرمایہ آیا۔ ورنہ اس سرمایہ کے بغیر اس کے لئے ناممکن تھا کہ وہ نئی صنعتیں لگا سکتا۔ کیونکہ ہندوستان کے پاس زمینیں، مزدوروں کی تعداد تو تھی مگر سرمایہ نہیں تھا۔

اس کے جواب میں قومی نقطہ نظر رکھنے والوں نے کہا کہ دراصل یہ کہنا غلط ہے کہ ہندوستان میں صنعتی ترقی ہوئی کیونکہ ہندوستان کے ذرائع کو برطانیہ کی صنعتی ترقی میں استعمال کیا گیا۔ اس لئے ہندوستان کی صنعتیں آزاد نہیں تھیں بلکہ یہ برطانوی صنعتوں سے

جڑی ہوئی تھیں۔ اس لئے اگر ہندوستان میں معاشی تبدیلیاں آئیں۔ تو یہ بغیر کسی صنعتی ترقی کے آئیں۔ اس لئے اگر دیکھا جائے تو برطانوی حکومت ہندوستان کی صنعتی ترقی میں رکاوٹ بن گئی تھی۔ رینا ڈلے نے اسی چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا تھاکہ ہندوستان برطانیہ کے لئے خام اشیاء کی ایک منڈی بن گیا ہے۔ اور یہ خام مواد برطانوی ایجنٹوں کے ذریعہ جہازوں میں برطانوی فیکٹریوں کے لئے بھیج دیا جاتا ہے۔ اور پھر تیاری کے بعد اس مال کو برطانوی تاجر، برطانوی فرموں کے ذریعہ اپنی نوآبادیات میں بھیج دیتے ہیں۔

اس لئے ان کا کہنا تھا کہ غیر ملکی سرمایہ دراصل مقامی سرمایہ کو ابھرنے اور موثر کردار ادا کرنے سے روک رہا ہے۔ انہوں نے اس دلیل کو بھی رد کیاکہ ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی ترقی میں رکاوٹ ہے۔ ان کا نقطہ نظریہ تھا کہ آبادی کا بڑھنا بھی اس وجہ سے ہے کہ ہندوستان، برطانوی حکومت میں پس ماندہ ہو رہا ہے۔ اور اس کی ترقی رکی ہے، ورنہ اہل ہندوستان نہ تو سست و کاہل ہیں، نہ شاہ خرچ ہیں۔ اور نہ کام چور ہیں ان وجوہات کی بناء پر قومی نقطہ نظر رکھنے والے اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ہندوستان صرف اسی وقت معاشی طور پر ترقی کر سکتا ہے کہ جب یہاں سیلف گورنمنٹ ہوگی اور سیاسی طور پر اقتدار ان کے پاس ہو گا۔

بپن چندر نے اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ اگرچہ نوآبادیاتی نظام نے ہندوستان کو پس ماندہ رکھا مگر اس کے استحصالی حربوں اور طریقوں کی وجہ سے ہندوستان میں قومی تحریک کی ابتداء ہوئی۔ اور خاص طور سے یورپی تعلیم یافتہ طبقے میں قوم پرستی کے جذبات پیدا ہوئے۔

ابتداء میں قوم پرستی کی تحریک بڑی معتدل تھی، اور اس میں کسی قسم کی انتہا پسندی اور شدت نہیں تھی۔ بلکہ یہ اس کے قائل تھے کہ برطانوی حکومت سے حقوق کی جو جدوجہد کی جائے وہ پرامن ہونی چاہئے۔ کیونکہ یہ جدوجہد صرف تعلیم یافتہ طبقوں میں محدود تھی۔ اس لئے ان کے مطالبات بھی ان کے طبقاتی مفادات کو ظاہر کرتے تھے۔ اور یہ قطعی اس بات پر تیار نہیں تھے کہ اپنی تحریک میں عوام کو شریک کریں، کیونکہ ان کے اور عوام کے درمیان ایک گہری خلیج حائل تھی۔ اور یہ خود کو تعلیم یافتہ، روشن خیال، اور سمجھدار سمجھتے تھے۔ جب کہ عوام ان کے نزدیک جاہل، بے خبر، اور پس ماندہ تھے۔ اس وجہ سے اس وقت کی تحریکوں میں عوام کی شمولیت کا کوئی بھی خواہش مند نہیں تھا۔ اور بپن چندر پال اور تلک جیسے لیڈر کہ جنہوں نے انتہا پسندی کی تحریکیں چلائیں۔ انہوں نے بھی نچلے

متوسط طبقوں سے اپیل کی' اور عوام کو اپنی تحریکوں سے دور رکھا۔

ان ابتدائی قوم پرستوں کا یہ خیال تھا کہ صرف تعلیم یافتہ لوگوں کو متحد کر کے وہ حکومت پر زور ڈال سکتے ہیں کہ ان کے مطالبات کو تسلیم کر لیا جائے۔ اس وجہ سے ان کی تحریک کا دائرہ تنگ تھا۔ اور وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ کوئی موثر تحریک چلا سکیں۔ انہیں اس زمانہ میں نہ تو ہندوستانی زمینداروں سے اور نہ ہی سرمایہ داروں سے کسی قسم کی مالی امداد ملی۔

ہندوستان کی قومی تحریک میں عوام اس وقت آئے جب اس کی راہنمائی گاندھی نے سنبھالی۔ اس وقت سرمایہ دار کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کانگریس کی مالی امداد کرے تاکہ یہ تحریک اس کے خلاف نہ ہو جائے۔ اور کانگریس کو بھی ان کی مالی امداد کی ضرورت تھی۔ کیونکہ ۱۹۱۹ء کے بعد سے کانگریس اپنے اراکین کی تعداد میں بے حد اضافہ کر چکی تھی۔ اس کے پاس اپنے کل وقتی رضاکار تھے۔ اور اسے انتخابات لڑنے' اسٹرائک' اور ایجی ٹیشن کے لئے سرمایہ کی ضرورت تھی۔ لیکن جہاں انہوں نے سرمایہ داروں سے مالی امداد لی تو اس کے ساتھ ہی وہ ان کے مفادات کا تحفظ کرنے لگے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاہے انتہا پسند ہوں' یا معتدل یا گاندھی ان میں سے کسی نے کسانوں اور عوام کے مسائل کو نہیں اٹھایا۔ اور صرف ان معاملات پر توجہ دی کہ جن کا تعلق سرمایہ داروں اور بورژوا کلاس سے تھا۔

بپن چندر نے ہندوستان کے سرمایہ دار طبقہ کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ طبقہ ہندوستان میں برطانوی سرمایہ دار سے مقابلہ کی صورت میں پیدا ہوا۔ اس لئے یہ ان کا گماشتہ نہیں تھا۔ بلکہ ان سے مقابلہ کرتا تھا۔ ان میں سے اکثر سرمایہ دار خاندان عہد برطانیہ کی پیداوار تھے۔ اس لئے ان کے دلوں میں برطانوی حکومت کے لئے عزت و احترام تھا۔ اور یہ اپنی روز مرہ کی زندگی اور کاروباری معمولات میں حکومت کے محتاج تھے۔ اسلئے جب حکومت ملک میں امن و امان پر زور دیتی او مزدوروں کی اسٹرائک کو ختم کرتی تو یہ ان کے مفاد میں تھا۔ کہ قومی تحریک کو اعتدال کی شکل میں رکھیں اور اسے پر تشدد نہیں ہونے دیں۔

اس لئے ان کی یہ کوشش رہی کہ قومی تحریک محدود رہے۔ وسیع و ہمہ گیر نہیں ہو۔ اور اگر حکومت سے جدوجہد کی جائے تو یہ طویل نہ ہو۔ بلکہ جلدی کسی مفاہمت پر پہنچ جائے۔ عوام کو تحریک سے دور رکھا جائے۔ کیونکہ عوام کی شرکت تحریک کو پر تشدد بنا دے

گی اور اس سے صنعتی و معاشی ترقی متاثر ہو گی۔ اس لئے انہوں نے بائیں بازو کی جماعت کو آگے بڑھنے سے روکا۔ سرمایہ داروں کی خواہش یہ تھی کہ اگر برطانوی حکومت ختم ہو۔ تو یہ مفاہمت اور مراعات کے ذریعہ ہو۔ یہ نہ ہو کہ حکومت کو اس قدر مجبور کر دیا جائے کہ اسے جھکنا پڑے' اس لئے حکومت سے صرف وہ مطالبات کرنے چاہئیں کہ جو وہ قبول کر سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے مطالبات وقت کو دیکھتے ہوئے کئے گئے۔ مثلاً ۱۹۲۰ء کی دہائی میں وہ کرنسی اور ٹیرف کے سلسلہ میں مراعات چاہتے تھے۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں یہ اتنی سیاسی طاقت چاہتے تھے کہ جس میں یہ غیر ملکی سرمایہ پر پابندی لگا دیں۔ ۱۹۳۹ء میں انہوں نے اقتدار کے تبادلہ کی حمایت کر دی۔

معتدل پسندوں کی اس پالیسی کے خلاف پہلی جنگ عظیم کے بعد انتہا پسندوں کے ایسے گروپ اور جماعتیں بنیں جو مسائل کا حل بات چیت' گفتگو' اور لین دین کی شکل میں دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ یہ ایک طویل جدوجہد ہے کہ جس میں عوام کو کچھ نہیں ملے گا۔ اس لئے انہوں نے دہشت و تشدد کی پالیسی کو اختیار کرتے ہوئے کوشش کی کہ غیر ملکی حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے۔ لیکن ان کی بنیادی غلطی یہ رہی کہ انہوں نے کوئی ایسی جماعت تشکیل نہیں دی کہ جس میں عوام کی شمولت ہو' اور اسی لئے یہ لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب نہیں رہے۔ ان کی قربانیوں سے معاشرہ میں جو قومی جذبہ اور شعور پیدا ہوا۔ اس کا فائدہ بھی آگے چل کر کانگریس نے اٹھایا۔ اور اس کے ذریعہ اپنے بورژوا پروگرام کو پورا کرنے کی کوشش کی۔

قومی تحریک کے آخر میں فرقہ واریت نے اس میں رخنے ڈالے' بپن چندر نے کانگریس کے راہنماؤں پر تنقید کرتے ہوئے ان پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ انہوں نے فرقہ واریت کو روکنے کی کوئی بھرپور جدوجہد نہیں کی۔ بلکہ طبقہ اعلیٰ کے مسلمانوں سے بات چیت کر کے کوشش کی کہ انہیں اپنے ساتھ ملایا جائے۔ انہوں نے اس طرف توجہ نہیں دی کہ مسلمان عوام کے مسائل اور ان کی ضروریات کو دیکھا جائے اور ان کے ساتھ روابط بڑھائے جائیں۔ دوسرے کانگرس نے اپنے اندر فرقہ پرست اور انتہا پسندوں کو شامل کئے رکھا۔ اور ان کی سرگرمیوں پر کوئی پابندی عائد نہیں کی۔

فرقہ واریت کے جذبات صرف اس وقت کم ہو جاتے تھے جب انگریزوں کے خلاف تحریک زوروں پر ہوتی تھی جیسے خلافت و عدم تعاون کے وقت یا سائمن کمیشن کے خلاف جب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مگر جیسے ہی یہ اینٹی سامراج تحریکیں ختم ہوتیں۔ فرقہ

وارثت ان کی جگہ لے لیتی اور مذہبی اختلافات بڑھ جاتے۔ بپن چندر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اگر فرقہ پرستی کے خلاف شروع ہی سے موثر اقدامات کئے جاتے' اور اس کی وجوہات اور پھیلاؤ کو سمجھا جاتا' تو اسے ابتدائی دور میں روکا جا سکتا تھا۔

ماڈرن انڈیا میں فرقہ واریت

بپن چندر کی یہ کتاب کئی لحاظ سے بڑی اہم ہے' کیونکہ اس میں انہوں نے فرقہ واریت کی صرف تاریخ ہی نہیں دی ہے بلکہ یہ کن حالات میں پیدا ہوئی۔ اور کیوں کر ہندوستان میں فروغ ہوا اس پر فکری طور پر بحث کی ہے۔ ان کے نظریہ کے مطابق فرقہ واریت ہندوستان میں نہ تو تاریخی ارتقاء و ترقی کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے۔ اور نہ یہ لوگوں میں موجود تھی۔ بلکہ یہ ہندوستان میں نو آبادیاتی نظام کے بعد جو سیاسی معاشی اور سماجی تبدیلیاں ہوئیں' ان کے نتیجہ میں پیدا ہوئی اور ہندوستان کی فرقہ واریت کوئی علیحدگی پسندوں کی تحریک نہیں تھی۔ کیونکہ اگر اس میں ایک طرف مسلمان علیحدگی کی بات کرتے تھے تو دوسری طرف ہندو قوم پرستی کی اور پھر یہ تصادم ہندوؤں اور مسلمانوں ہی کے درمیان نہیں تھا بلکہ سیکولر قوم پرستوں سے بھی تھا۔

ہندوستان میں چونکہ قومیت کی جڑیں نہیں تھیں اور لوگوں کی شناخت کسی مذہب کے پیروکار کی وجہ سے ہوتی تھی اس لئے اس کی وجہ سے شناخت کی دوسری علامتیں دب گئیں ۔ اور مذہبی شناخت زیادہ ابھر کر آئی۔ اس شناخت کی وجہ سے ہندوستان میں فرقہ واریت کے جراثیم طاقت ور ہوئے اور جب ان کا مقابلہ ہوا تو ہر مذہب نے اپنی تاریخ کا سہارا لیتے ہوئے اپنے ہیرو تخلیق کئے۔ اور تاریخ کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔

عام طور سے فرقہ وارانہ تحریکوں کی راہنمائی متوسط اور طبقہ اعلیٰ کے افراد کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ اور یہ اپنے مفادات کو اپنی کمیونٹی کے مفادات بنا کر پیش کرتے ہیں۔ مثلاً جب یہ کہا گیا کہ مسلمانوں کا ملازمتوں میں کوٹہ مقرر کیا جائے یا لوکل باڈیز اور میونسپلٹیوں میں ان کی سیٹیں علیحدہ کی جائیں تو درحقیقت یہ مسلمان متوسط تعلیم یافتہ طبقہ کے مفادات تھے۔ عام مسلمانوں کے نہیں' مگر ان مطالبات کو اس طرح سے پیش کیا گیا کہ یہ عام مسلمانوں کے معلوم ہوئے۔

نو آبادیاتی نظام میں چونکہ معاشی ترقی نہیں ہوئی تھی اور ملک معاشی طور پر پسماندہ رہا اس لئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے ملازمتوں کے مواقع محدود رہے۔ اس وقت بھی سب

سے زیادہ ملازمتیں حکومت کے شعبوں میں ملتی تھیں۔ اور یہاں یہ حالت تھی کہ ۱۹۳۰ء کی دہائی تک اعلیٰ عہدوں پر صرف انگریزوں کو رکھا جاتا تھا۔ اس لئے متوسط طبقہ نے اپنی کمیونٹی کی بنیاد پر یہ مطالبات کئے کہ ملازمتوں میں ان کا کوٹہ مقرر کیا جائے۔ اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں جھگڑے کی ابتداء ہوئی۔

فرقہ وارانہ فسادات کی ایک اہم خصوصیت یہ رہی کہ اس میں اگرچہ لیڈر شپ متوسط طبقہ کے پاس رہی مگر نقصان ہمیشہ غریب اور عام لوگوں کا ہوا۔ انہیں کے گھربار جلے اور وہی قتل ہوئے جب کہ اوپر کے لوگ ان جھگڑوں سے دور رہے اور صرف ان سے صرف فوائد حاصل کئے۔

ہندوستان میں فرقہ واریت مختلف علاقوں میں علیحدہ علیحدہ وجوہات کی بنا پر پیدا ہوئی۔ مثلاً ان علاقوں میں کہ جہاں مسلمان کسان و کاشت کار تھے اور ہندو زمیندار و جاگیردار' وہاں مذہب کی بنیاد پر ظالم اور مظلوم کی شناخت کی گئی۔ جیسا کہ بنگال اور جنوبی مالابار میں موپلاؤں کے علاقہ میں ہوا۔ مگر جہاں یہ صورت حال نہیں تھی وہاں دوسری وجوہات کی تلاش کی گئی۔ مثلاً سندھ اور پنجاب میں کسان اور زمیندار دونوں مسلمان تھے۔ لہٰذا یہاں فرقہ واریت کے لئے ہندو بنئے' ساہوکار' اور سود پر روپیہ دینے والے چنے گئے۔ اور اس طرح مسلمان زمینداروں نے ایک طرف تو اپنے مظالم کو چھپا لیا کہ جو وہ اپنے کسانوں پر کرتے تھے دوسرے اس ذریعہ سے انہوں نے اپنے مفادات کا تحفظ کیا۔ اس طرف سے ہندو بنیوں اور ساہو کاروں نے اپنے مفادات کے لئے ہندو فرقہ واریت میں پناہ لی۔

اس لئے فرقہ واریت نے معاشرہ کو اور زیادہ پس ماندہ بنا دیا۔ ایک تو اس کی وجہ سے طبقاتی شعور پیدا نہیں ہوا۔ اور غریب و مظلوم عوام اپنے جائز حقوق کے لئے جدوجہد نہیں کر سکے۔ دوسرے یہ سامراج کے خلاف نہیں ہوا۔ اور نو آبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد کے بجائے اس نے لوگوں کو آپس میں برسرپیکار رکھا۔ دوسرے بنیادی طور پر یہ جمہوری نظام اور روایات کے خلاف تھا۔ اس لئے فرقہ واریت کی وجہ سے برطانوی حکومت کو فائدہ ہوا۔

فرقہ واریت کے پیدا ہونے کی ایک اور وجہ ہندوستان میں قومیت کی کمی تھی۔ ابتداء میں قوم پرستی کے جذبات متوسط اور اوپری طبقوں میں آئے کہ جن میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے۔ مگر نچلے طبقوں میں یہ جذبات اپنی جڑیں نہیں پکڑ سکے کیونکہ صرف اوپری طبقے اس کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کر رہے تھے۔ اس لئے نچلے طبقوں کے لئے وہ ہی

صورتیں تھیں کہ یا تو وہ بائیں بازو کی تحریکوں میں شامل ہو جائیں اور یا فرقہ واریت کی طرف چلے جائیں۔ حکومت کی مخالفت کی وجہ سے کیونکہ بائیں بازو کی جماعتوں کو کام کرنے کی آزادی نہیں تھی اس لئے لوگوں کی اکثریت فرقہ پرستی کی طرف مائل ہو گئی۔

اقلیتی جماعتوں میں فرقہ واریت اس احساس کے ساتھ ہوتی ہے کہ اکثریتی جماعت ان کی تہذیب و ثقافت' اور ان کی شناخت کو ختم کر دے گی۔ ہندوستان میں یہ احساس مسلمانوں کو ہوا۔ اور اسی وجہ سے انہوں نے فرقہ واریت کے ذریعہ اپنی شناخت کو قائم رکھنا چاہا۔ ہندوؤں نے اس کے مقابلہ میں یہ دلیل دی کہ اگرچہ مسلمان ہندوستان میں اقلیت میں ہیں مگر یہ دوسرے مسلمان ملکوں کے ساتھ مل کر سیاسی اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اور چونکہ ہندو قوم فطرتاً نرم مزاج اور امن پسند ہے اس لئے یہ ان پر اپنا تسلط قائم کر لیں گے۔ اس لئے ہندوؤں کو اپنے تحفظ کے لئے طاقت ' قوت اور عزم کی ضرورت ہے۔

بپن چندر نے فرقہ واریت کے پیدا ہونے میں ہندو راہنماؤں پر تنقید کی ہے کہ یہ راہنما جو اگرچہ قومی راہنما تھے مگر ان کی قوم پرستی میں ہندو مت کے اثرات تھے۔ اور جب ہندوستان کی تاریخ کی بات کی جاتی تھی تو اس میں قدیم ہندوستان کو تو زیادہ ابھارا جاتا تھا' مگر مسلمانوں کی حکومت کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا' یا اس کی مذمت کی جاتی تھی۔ اسی طرح بنکم چٹرجی کے ناولوں میں مسلمانوں کے خلاف مواد بھرا ہوا تھا اس رویہ نے مسلمانوں میں فرقہ واریت کے جذبات کو خوب بھڑکایا۔

مسلمان میں فرقہ واریت ۱۹۳۸ - ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء میں پھیلی۔ اور ابتداء میں یہ کہا گیا کہ مسلمانوں کے مفادات خطرے میں ہیں' بعد میں اسلام خطرے میں ہے کہ نعرہ بلند کیا گیا اور اس طرح سے مذہب کی بنیادوں پر عوام کو ابھارا گیا اور اس سلسلہ میں مولویوں اور پیروں کو سیاست میں لایا گیا۔ کیونکہ قومیت اور طبقاتی تقسیم کا شعور گہرا نہیں تھا اس لئے مذہب کو موقع ملا کو وہ لوگوں کے جذبات کو بھڑکائے۔

مسلمانوں میں اس لئے بھی فرقہ پرستی کی جڑیں جلدی گہری ہوئی کہ یہ بحیثیت جماعت کے پہلے پس ماندہ تھے۔ اور ان میں احیاء کی تحریکیں برابر پیدا ہو رہیں تھیں جن کی وجہ سے ان میں جدیدیت کے خلاف جذبات پائے جاتے تھے۔ نوآبادیاتی نظام نے ان کا سماجی ڈھانچہ بدل دیا تھا جس سے سب سے زیادہ امراء اور علماء متاثر ہوئے تھے۔ اور جدید تعلیم کے کم ہونے کی وجہ سے متوسط طبقہ کمزور اور تعداد میں کم تھا۔ اور اس کا رویہ بھی سیکولر

نہیں تھا بلکہ مذہبی تھا۔ لہذا جن راہنماؤں کے پاس لیڈر شپ تھی ان کا تعلق جاگیردار طبقہ سے تھا۔ اور اس حیثیت سے یہ لوگ نوآبادیاتی نظام کے خلاف ہونیوالی قومی تحریکوں سے دور تھے۔

جب کہ اس کے مقابلہ میں ہندوؤں کا متوسط طبقہ نچلی سطح سے ابھر کر آیا تھا اور اس میں عقل پرستی' سیکولرازم' اور جدید رجحانات تھے' اسی لئے وہ قومی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ اور اس کے ذریعہ وہ مزید مراعات حاصل کرنا چاہتے تھے۔

بپن چندر نے فرقہ واریت کے فروغ میں تاریخ کے استعمال پر روشنی ڈالتے ہوئے ان تاریخی تحریروں کا حوالہ دیا ہے کہ جن کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات بڑھے۔ ہندو فرقہ پرستوں کا تاریخی نقطہ نظر یہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمان غیر ملکی ہیں۔ اس لئے ہندو قوم کا حصہ نہیں ہیں۔ ان کے ہزار سالہ دور حکومت میں ہندوؤں نے اذیت برداشت کی ہے۔ اس لئے انہوں نے مسلمان دور حکومت کو اپنی تاریخ سے نکال کر اپنی عظمت قدیم ہندوستان میں تلاش کیا کہ جس میں صرف ہندو تھے اور جہاں کسی قسم کا تصادم نہیں تھا۔ مسلمان مورخوں نے بھی ایک لحاظ سے اس نقطہ نظر کو تسلیم کیا اور یہ دلیل دی کہ ہندو اور مسلمان مذہبی و تہذیبی لحاظ سے دو قومیں ہیں۔ اور ان کا ملاپ کبھی نہیں ہوا۔ اس لئے اب بھی یہ مل کر نہیں رہ سکتے ہیں۔

فرقہ واریت کے موضوع پر لکھتے ہوئے اکثر مورخ سارا الزام برطانوی حکومت پر لگا دیتے ہیں کہ انہوں نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کے تحت ان دونوں میں اختلافات کو پیدا کیا۔ انہیں آپس میں لڑایا۔ اور پھر آرام سے حکومت کی۔ بپن چندر نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے یہ دلیل دی ہے کہ اس سلسلہ میں انگریزوں کو مورد الزام ٹھہرانا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ فرقہ واریت ہمارے سیاسی و سماجی اور معاشی حالات کے نتیجہ میں پیدا ہوئی۔ یہ ضرور ہوا کہ انگریزوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا' کیونکہ اس کے ذریعہ انہوں نے قومی تحریکوں کو کمزور کرنے کی کوشش کی۔ اور یہ کوشش کی کہ ہندوستانیوں میں قومی شعور کو روکا جائے۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ برطانوی حکومت کو جب اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے موقع ملا اس نے ہندوؤں اور مسلمان فرقہ پرستوں کی سرپرستی کی۔ اور ان کے اختلافات سے فائدہ اٹھایا۔

ہندوستان میں معاشی قوم پرستی کی نشونما

بپن چندر نے اس موضوع پر بڑی تفصیل سے ان وجوہات کا تجزیہ کیا ہے کہ جن کی

وجہ سے ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ میں برطانوی حکومت کی معاشی پالیسیوں کی وجہ سے قوم پرستی کا جذبہ ابھرنا شروع ہوا اور جیسے جیسے ان کی معلومات بڑھتی گئیں۔ اس طرح سے قوم پرستی کی جڑیں مضبوط ہوتی چلی گئیں۔

بپن چندر نے اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ برطانوی اقتدار کے ابتدائی زمانہ میں جب کہ اہل ہندوستان کو نوآبادیاتی نظام اور اس کی خرابیوں سے زیادہ واقفیت نہیں تھی تو انہوں نے اس نظام کے ان پہلوؤں کو دیکھا کہ جس کی وجہ سے معاشرہ میں مثبت تبدیلیاں آئیں تھیں۔ مثلاً قانونی بالادستی اور امن و امان کا قائم ہونا۔ چونکہ ہندوستان اٹھارویں اور انیسویں صدی میں سیاسی انتشار اور افراتفری کے دور سے گزرا تھا۔ اس لئے قانون کی بالادستی اور امن و امان نے معاشرہ کو بڑا سکون دیا اور اسی لئے انہوں نے نوآبادیاتی نظام کی تعریف کی۔ اس کے علاوہ آہستہ آہستہ مغربی تعلیم کے پھیلاؤ نے اہل ہندوستان میں ایک ایسے طبقہ کو پیدا کیا کہ جو جدید خیالات سے واقف ہوا اور اس تعلیم کے ذریعہ جمہوری نظریات و خیالات ہندوستان کے معاشرہ میں آئے۔ اور روشن خیالی کے جذبات پیدا ہوئے۔ اس لئے انہوں نے برطانوی حکومت کی تعریف کی۔

لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی یورپی تعلیم یافتہ کلاس کو نوآبادیاتی نظام اور اس کے معاشی استحصال کے بارے میں معلومات ہوئیں۔ اور یہ معلومات و آگہی اس لئے ہوئیں کہ انہوں نے یورپی معاشیات کا مطالعہ کیا۔ اور اس نظام کے عمل کو اس کے ذریعہ سے سمجھا۔ اور پھر اس نتیجہ پر پہنچے کے نوآبادیاتی نظام ہندوستان کی معیشت کو نقصان پہنچا رہا ہے اور ہندوستانی معاشرے کی خرابیوں کی جڑ اس کا معاشی استحصال ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے اس بحث کی ابتداء کی ان میں دادا بھائی نوروجی۔ ایم جی' رناڈے' جی۔ وی جوشی' اور آر۔ سی۔ دت وغیرہ شامل تھے۔ انہوں نے خاص طور سے ہندوستان کی غربت کو موضوع بنا کر اس کا تجزیہ کرنا شروع کیا۔

اس سلسلہ میں جو دلیل دی جاتی تھی وہ یہ کہ ہندوستان کی غربت اس کی تاریخ میں ہے یہاں پر ہمیشہ سے دولت کی غیر مساوی تقسیم رہی اسی وجہ سے عوام ہمیشہ غربت اور مفلس رہے اور مشکل سے زندگی کی بنیادی ضروریات پوری کیں جبکہ قوم پرست طبقہ کی دلیل یہ تھی کہ اس غربت کی وجہ برطانوی حکومت ہے جو ہندوستان کی دولت اور ذرائع کی لوٹ کھسوٹ کر رہی ہے اور لوگوں کو ان کی ضروریات سے محروم کر رہی ہے۔ برطانوی حکومت کا کہنا یہ تھا کہ غربت کی ایک وجہ آبادی کا مسلسل بڑھنا ہے۔ جس کی وجہ سے

ذرائع کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کا جواب قوم پرستوں نے یہ دیا کہ ہندوستان میں ذرائع کی کمی نہیں ہے اور یہ بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے کافی ہے۔ مگر حکومت کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے یہاں قحط آتے ہیں۔ خشک سالی ہوتی ہے۔ اور لوگ ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ اسی لئے غربت معاشرہ میں ہوتی نہیں ہے اسے پیدا کیا جاتا ہے اسلئے اسے دور بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے جواب میں حکومت کا نقطہ نظریہ تھا کہ قحط اور خشک سالی قدرت کی طرف سے آتے ہیں اور اس میں انسان مجبور ہے۔ اس کا تجزیہ کرتے ہوئے بپن چندر نے صحیح کہا ہے کہ سائنس میں ترقی یافتہ مغرب اس سلسلہ میں نقطہ نظر رکھتا ہے کہ فطرت معاشرہ کی سماجی قوتوں پر قابو رکھتی ہے۔ جبکہ پسماندہ مشرق کے لوگ اس دلیل دیتے ہیں کہ انسان میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ فطرت اور معاشرہ پر قابو پا سکتا ہے۔

بپن چندر کے تجزیہ کے مطابق دوسرا پہلو جس کی طرف سے ہندوستان کے قوم پرستوں نے توجہ دی وہ نئی صنعتوں کا قیام تھا۔ لہذا انہوں نے ان صنعتوں کی وجہ سے معاشرہ میں جو تبدیلیاں آئی اس کی طرف نشان دہی کرتے ہوئے کہا کہ ان صنعتوں نے ایک طرف تو ہندوستان کی روایتی صنعت و حرفت کو تباہ کیا۔ اور دوسری طرف اس تباہی کے نتیجہ میں بڑے پیانہ پر بے روز گاری پھیلی۔ لیکن انہوں نے صنعتی ترقی کی اس حد تک مخالفت کی کہ اس کی وجہ سے غیر مساوی ترقی ہوئی ہے۔ اگر ہندوستان میں جدید سطح پر صنعتی ترقی ہو تو یقیناً یہ اس کی معاشی پسماندگی کو دور کرے گی۔ لیکن ملک کو صنعتی بنانے کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ اس لئے اول اس سرمایہ کو روکنا چاہیئے جو کہ برطانیہ چلا جاتا ہے۔ دوسرے ہندوستانیوں کو سرمایہ کاری کرنا چاہیئے۔ اور سرمایہ کاری کے علاوہ جدید صنعتی ترقی کے لئے نہ صرف فنی تعلیم ضروری ہے۔ بلکہ اس کے لئے مہم کاری کی بھی ضرورت ہے' اس لئے ہندوستان کو جدید دور میں داخل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے سماجی ادارے اور روایات کو بدلا جائے' کیونکہ یہ فرسودہ روایات اس کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

اس موقع پر معاشیات اور سیاست دونوں اس طرح سے ایک ہوئے کہ قوم پرستوں نے یہ تحریک چلائی کہ غیر ملکی اشیاء کا بائیکاٹ کیا جائے اور اس کی جگہ ہندوستانی چیزوں کو استعمال کیا جائے۔ لیکن اپنے ابتدائی مرحلہ میں یہ تحریک زیادہ کامیاب اس لئے نہیں ہو سکی کہ اس وقت قوم پرستی کے جذبات اس قدر گہرے نہیں تھے۔

جب ہندوستان میں ریلوے لائینیں بچھائی گئیں تو اس کے فوائد پر حکومت نے بڑا

پروپگنڈا کیا۔ لیکن قوم پرست لیڈر شپ نے اس کی بھی سخت مخالفت کی اور اس پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اس کی وجہ سے ہندوستان کی صنعتیں تباہ ہوئیں۔ اور اس نے سرمایہ کو ہندوستان سے باہر نکالنے میں مدد دی' اس کے علاوہ اس نے اناج کی درآمد کو بڑھا دیا ہے اور ملک میں اس کی وجہ سے قحط کے خطرے بڑھ گئے ہیں' اس لئے ریلوے نے دیہاتی ذرائع کے لوٹ کھسوٹ میں اور اضافہ کر دیا ہے۔

حالانکہ ریلوے کی وجہ سے ہندوستان کی معیشت میں زبردست تبدیلیاں آئیں ان میں سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ اس نے ایک کمرشل انقلاب کو پیدا کیا۔ اور اس کی وجہ سے مختلف علاقوں میں آب و ہوا کی وجہ سے ایسی فصلوں پر توجہ دی جانے لگی کہ جس سے تجارتی طور پر کسانوں کو فائدہ ہو' دوسرا اثر یہ ہوا کہ پورے ملک میں چونکہ سامان تیزی سے آنے جانے لگا اس لئے چیزوں کی قیمتیں ہر علاقہ میں یکساں ہو گئیں۔ اور ریلوے کی وجہ سے ہندوستانی تاجروں کو یہ موقع ملا کہ انہوں نے دیہاتی علاقوں میں بھی سرمایہ کاری شروع کر دی' مگر قوم پرست راہنماؤں نے اس کے منفی پہلوؤں کو دیکھا اور ان کو اجاگر کیا۔

مگر جس مسئلہ پر قوم پرست لیڈر شپ کی کمزوری کھل کر سامنے آئی اور اس کا طبقاتی کردار ابھر کر آیا وہ صنعتی مزدوروں کے مسائل تھے۔ اگرچہ اس ابتدائی دور میں مزدوروں کی تعداد کم تھی۔ مگر فیکٹریوں' کانوں' کھیتوں' اور ٹرانسپورٹ میں مزدوروں کی خاصی تعداد آ چکی تھی' اور ان مزدوروں کا کام کا ماحول انتہائی خراب اور اذیت ناک تھا۔ یہ ۱۲ گھنٹوں سے لیکر اٹھارہ گھنٹوں تک کام کرتے تھے۔ سال میں صرف ۱۵ چھٹیاں ملتی تھیں۔ عورتوں و بچوں کی حالت اور بھی خراب تھی کیونکہ انہیں اتنی مدت کی مزدوری کی تنخواہ اور بھی کم ملتی تھی۔ اس لئے جب حکومت کی جانب سے ان مزدوروں کی اصلاحات کے لئے مختلف ایکٹ پیش ہوئے تو اس کی مخالفت قوم پرست لیڈر شپ نے کی۔ کیونکہ ان فیکٹریوں کے اکثر مالک ہندوستانی تھے۔ اس لئے ان کی ہمدردیاں سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کے ساتھ تھیں اور وہ طویل کام کے اوقات' بچوں کی مزدوری' کم تنخواہ' اور کم چھٹیاں ان سب کو جائز قرار دیتے تھے۔ اور اس کی دلیل یہ دیتے تھے کہ ہندوستان کو صنعتی ملک بنانے اور انگلستان کی صنعت سے مقابلہ کرنے کے لئے مزدوروں کو قربانی دینی چاہئے۔

چنانچہ دادا بھائی نوروجی' جی۔ وی۔ جوشی' اور آر۔ سی۔ دت جو ہندوستانی غربت پر روتے تھے۔ اور جو نوآبادیاتی معاشی استحصال کے خلاف لکھتے تھے۔ انہوں نے مزدوروں کی

حالت زار' غربت' اور ان کے مسائل پر ایک لفظ نہیں لکھا۔ اور نہ مشہور راہنما گوکھلے نے ان کے مسائل پر کچھ کہا۔ اور نہ ہی کانگریس نے ان کی ہمدردی میں کوئی ریزولوشن منظور کیا۔ انہوں نے صرف اس وقت مزدوروں کے لئے اواز اٹھائی جب وہ برطانوی سرمایہ داروں کی ملازمت میں رہے جیسے آسام کے قلی' مگر جب ہندوستانی سرمایہ داروں نے ان کا استحصال کیا تو وہ بالکل خاموش رہے۔

یہی صورت حال زراعت کی تھی۔ کہ قوم پرست راہنماؤں نے حکومت کی زرعی پالیسیوں پر تو نکتہ چینی کی' اور لگان کی زیادتی کو کسانوں کی غربت کی وجہ قرار دیا مگر انہوں نے ہندوستانی زمینداروں کے استحصالی کردار پر کچھ نہیں کہا' اور دیہات میں ساہوکار کے ظلم پر بھی خاموش رہے کہ جو وہ کسانوں کو سود پر روپیہ دے کر ان سے ساری زندگی سود وصول کرتا تھا۔

انہوں نے اپنی تنقید کا نشانہ صرف برطانوی حکومت اور نوآبادیاتی نظام کو بنایا۔ حکومت کی ٹیکس کی پالیسی پر احتجاج کیا۔ فوجی اخراجات کی زیادتی پر شور مچایا اور حکومت کو مورد الزام ٹھہرایا کہ وہ تعلیم' صحت اور لوگوں کی فلاح و بہبود پر خرچ نہیں کرتی ہے۔ انہوں نے اس پر بھی آواز بلند کی کہ ہندوستانی روپیہ کئی طریقوں سے انگلستان جا رہا ہے۔ اور اس کی وجہ سے ہندوستان کی معیشت تباہ ہو رہی ہے' اور سرمایہ کی یہ منتقلی ایک مستقل نیچر ہے' جو ملک کو کنگال کر دے گا۔

اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود ہندوستانی معیشت دانوں اور راہنماؤں نے جن اقتصادی مسائل کو اٹھایا' اور نوآبادیاتی لوٹ کھسوٹ کو ظاہر کیا اس نے قومیت کی تحریک کو اور آگے بڑھایا' اور اہل ہندوستان میں اس خیال کو تقویت دی کہ صرف آزادی کی صورت میں اور نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ کے بعد ہی وہ ہندوستان کے ذرائع اور اس کی دولت کو ملک کی ترقی کے لئے استعمال کر سکیں گے اور یہی وہ بنیاد تھی جس پر ملک کی آزادی کی بنیاد پڑی۔

فرقہ واریت برطانوی عہد میں

گیانندر پانڈے' ہندوستان کے ان جدید مورخوں میں سے ہیں کہ جو ان تحریکوں' نظریات' اور تاثرات کا جائزہ لے رہے ہیں کہ جو نوآبادیات اس کے نظام اور اس دور کی لکھی ہوئی تاریخ کی وجہ سے ہوئے۔ نوآبادیاتی دور کی تاریخ نویسی نے جو ذہن بنایا ہے اس سے ہندوستانی معاشرہ اور اس کی ساخت کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں اور تعصبات پیدا ہو گئے ہیں کہ جن کا شکار ہندوستان کا موجودہ معاشرہ ہے۔ ان تعصبات کا خاتمہ اسی وقت ہو گا جب تاریخ کو نوآبادیاتی دور کے نظریات سے آزاد کرایا جائے گا۔

اگرچہ ہندوستان میں مختلف مذاہب' ذاتوں' برادریوں اور قوموں کے لوگ آباد تھے اور اور ان میں مذہبی اختلافات سے لے کر لسانی اور ثقافتی فرق موجود تھے مگر فرقہ واریت کی ابتداء ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے قائم ہونے کے بعد سے ہوئی' ورنہ اس سے پہلے مختلف فرقوں میں اپنی شناخت کو تسلیم کرانے کے لئے جارحانہ انداز نہیں تھا۔ ہندوستان میں سب سے پہلے کیونٹی کا لفظ اسی دور میں استعمال ہونا شروع ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ نسل کا لفظ خالص باؤلوجیکل اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور قوم یورپ میں "قومی ریاست" میں رہنے والوں کے لئے تھی' جبکہ ہندوستان ایک قومی ریاست نہیں تھی اس لئے یہاں کے لوگوں کے لئے کیونٹی کا استعمال ہوا۔ ڈبلیو۔ سی۔ اسمتھ نے "ماڈرن اسلام ان انڈیا" میں اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کیونٹی سے مراد لوگوں کی ایک ایسی جماعت ہے جن کا تعلق ایک مذہب سے ہو اور جن میں سماجی' سیاسی' اور معاشی قدریں مشترک ہوں' اور دوسری جماعتوں سے ان بنیادوں پر اختلاف رکھتے ہوں۔ بپن چندر نے اپنی کتاب "کیونل ازم ان ماڈرن انڈیا" میں اس کے بارے میں لکھا ہے کہ کیونل ازم میں یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ جن لوگوں کا تعلق ایک مذہب سے ہے۔ ان کے سیاسی سماجی اور معاشی مفادات بھی ایک ہیں۔

۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کی دہائیوں میں کیونل ازم کی اصطلاح ان خاص معنوں میں استعمال ہونے لگی اور اسے ہندوستان کے قوم پرستوں نے بھی استعمال کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً ۱۹۶۸ء میں نہرو رپورٹ میں کہا گیا کہ۔ "فرقہ واریت بنیادی طور پر ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات کا نام ہے" اس لئے اس دور میں فرقہ واریت قوم پرستی کی تحریک کے لئے ایک خطرہ بن کر ابھری اور فرقہ واریت کا سوال سیاست کا ایک اہم مسئلہ بن کر رہ گیا

جس کی طرف برطانوی حکومت اور قوم پرستوں دونوں نے توجہ دی۔

برطانوی حکومت کا نقطہ نظر یہ تھا کہ فرقہ واریت کی جڑیں ہندوستان کی تاریخ میں پیوست ہیں۔ اس لئے یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ تاریخی عمل کی پیداوار ہے۔ اس کے برعکس قوم پرستوں کی دلیل یہ تھی کہ فرقہ واریت نوآبادیاتی نظام کے قائم ہونے کے بعد سیاسی' سماجی اور معاشی حالات کی تبدیلی کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے لہٰذا یہ اسی وقت دور ہو گی کہ جب نوآبایاتی نظام کی خرابیاں ختم ہوں گی۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس بات کی بھی نشان دہی کہ کہ نوآبادیاتی دور میں ہندو اور مسلمانوں کے اختلافات کو خاص طور سے تاریخ کے ذریعہ ابھارا گیا ہے اور تاریخ کواس طرح سے پیش کیا گیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن نظر آئیں۔ کیونکہ اس کے ذریعہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اہل ہندوستان آپس میں لڑتے رہتے تھے' ان میں مذہبی و سیاسی و سماجی اختلافات تھے اور یہ صرف برطانوی حکومت ہے کہ جو ان میں خانہ جنگی کو روکے ہوئے ہے اس لئے اسکا قائم رہنا ہندوستان کے مفاد میں ہے۔

شمالی ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کی ابتداء انیسویں صدی کے ابتدائی دور سے شروع ہوئی اور ان فسادات کی خاص بات یہ تھی کہ ان میں جولاہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر جولاہے کیوں اس قدر متعصب ہو گئے۔ اور کیوں وہ فسادات میں ملوث ہوئے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے پانڈے نے اس صنعتی عمل کی جانب اشارہ کیا ہے کہ جس کی وجہ سے جولاہے متاثر ہوئے۔ نئی سائنسی اور ٹکنالوجی ترقی اور انگلستان میں صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں ان کی کپڑے کی صنعت کے فروغ نے ہندوستان میں کپڑے کی صنعت پر اثر ڈالا جس کے نتیجہ میں جولاہے اپنا آبائی پیشہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ بے روزگاری کی وجہ سے ان میں اکثر کو مزدوری سے لے کر نچلے درجہ کے کام کرنا پڑے۔ اس لئے ان کی ذات ذلت و حقارت کا شکار ہوئی۔ انہیں اپنے جس پیشہ پر فخر تھا اور جو ان کے لئے شناخت تھا۔ اس سے محرومی نے ان کی زندگی میں خلا پیدا کر دیا' اور اس حالت میں انہیں اپنے گزرے ہوئے اچھے دن یاد آنے لگے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ جولاہوں کی اکثریت شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی تھی اور کاروبار میں ان کا واسطہ ہندو دلالوں اور ساہوکاروں سے رہتا تھا جو کہ انہیں سود پر روپیہ دیا کرتے تھے۔ سماجی تبدیلی کی اس صورت حال سے زیادہ فائدہ ہندوؤں کے ان دونوں طبقوں کو ہوا' جبکہ جولاہوں کو نقصان ہی نقصان ہوا یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنی محرومیوں کے

نتیجہ میں مذہب میں پناہ لی اور مذہبی بنیادوں پر انہوں نے ہندو ساہوکاروں کے خلاف فسادات میں حصہ لیا۔ ان جولاہوں میں مذہبی تشدد اس لئے آیا کہ سماجی اور معاشی محرومیوں کے نتیجہ میں مذہبی علامات' مذہبی رسومات' اور پرہیز گاری کا اظہار معاشرہ میں باعث عزت بن گیا۔ اسی لئے جھگڑوں اور فسادات میں دونوں جانب سے مذہبی علامات و نشانات کو اختیار کیا گیا۔

انیسویں صدی میں ذات پات کی مختلف تحریکیں شروع ہوئیں جس کی وجہ سے علیحدہ علیحدہ کمیونٹی میں اپنی شناخت کی جڑیں تلاش کرنے اور خود کو دوسروں سے ممتاز کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس عمل کو پیدا کرنے میں نوآبادیاتی نظام اور اس کی اصلاحات کا بڑا دخل تھا۔ مثلاً ۱۹۰۱ء کی مردم شماری میں حکومت نے اس بات پر زور دیا کہ ہر شخص اپنی ذات اور کمیونٹی کو رجسٹر کرائے۔ اسلئے تبدیل ہوتے ہوئے سماجی حالات میں ہر ذات کی یہ کوشش ہوئی کہ وہ معاشرہ میں باعزت مقام حاصل کرنے کے لئے خود کو اعلیٰ و برتر ثابت کرے چنانچہ ۱۹۰۱ء اور ۱۹۱۱ء کے درمیان مسلمان راجپوتوں نے خود کو خان کہلوانا شروع کر دیا جب کہ دوسری نچلی ذاتیں جن میں جولاہے' تیلی' اور نائی وغیرہ تھے یہ شیخ بن گئے۔ اگرچہ جو اونچی کلاس کے مسلمان تھے انہوں نے ان دعوں کو تسلیم نہیں کیا۔

ذاتوں کو بڑھانے کا یہ سلسلہ مسلمانوں میں ہی نہیں تھا بلکہ ہندوؤں میں بھی یہ عمل جاری تھا۔ ان میں چامہ ذات کے لوگوں نے خود کو ست نامی (سچے دیوتا) کہا اور اہیروں اور کرمیوں نے بھی اپنی ذاتوں کو بلند کیا۔ اپنے اس بلند درجوں کے بعد ان ذاتوں نے بیگار کرنا بند کر دیا اور اپنی عورتوں کو گھروں میں رکھنے لگے۔ انہیں صرف پردہ میں رکھنا ہی مقصد نہیں تھا۔ بلکہ یہ تھا کہ اونچی ذات کے لوگوں سے ان کی عزت محفوظ رکھی جائے۔

اس کے بعد ان چھوٹی چھوٹی کمیونٹیوں میں اصلاحی تحریکیں شروع ہوئی اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے یا انہیں حاصل کرنے کے لئے انہوں نے اپنی اپنی جماعتیں بنائیں۔۔ اور اپنی ذات کی اہمیت و شناخت کی خاطر ان میں مذہبی احیار کی تحریکیں اٹھیں۔ مثلاً جولاہوں نے جو کہ نومسلم تھے۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کے طبقہ اشراف میں ان کی عزت نہیں تھی۔ لہٰذا انہوں نے خود کو سچا اور پاک و خالص مسلمان بنانے کے لئے اپنے ہاں سے ان رسومات کو ختم کرنا شروع کیا جو ہندوؤں کی تھیں تاکہ مسلمان اشراف طبقہ میں شامل ہو سکیں۔ انہوں نے خالص مسلمان نام اختیار کرنا شروع کر دیئے۔ اور یہ ثابت کیا کہ ان کے آباؤاجداد دراصل عرب سے آئے تھے' اور اسی لئے ۱۹۱۱ء کی مردم شماری میں انہوں نے

خود کو مومن اور انصاری کے نام سے رجسٹر کرایا۔

اور ہندوؤں میں جن ذاتوں نے خود کو بلند کرنا چاہا تھا۔ ان میں خالص ہندو رسومات کا احیار ہوا اس طرح دونوں طرف سے احیاء کی تحریکوں نے ان میں مذہبی خدمات کو پیدا کیا۔ اسی لئے ایک طرف جب جولاہے بقر عید پر گائے کی قربانی کو مذہبی فرض سمجھتے تھے تو اہیر جنہوں نے گوالہ تحریک شروع کی تھی' وہ گائے کی حفاظت اپنا مذہبی فریضہ گردانتے تھے' لہٰذا دونوں اس مسئلہ پر کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے پر تیار نہیں تھے۔ اور یہ وہ مسائل تھے جو آگے چل کر فرقہ پرستی کی بنیاد بنے۔

ذات اور کمیونٹی کی شناخت کے ساتھ ہی یہ کوشش بھی کی گئی کہ تاریخ کے ذریعہ وہ اعلیٰ اور برتر مقام حاصل کریں اس لئے مختلف کمیونٹیوں نے اپنی اپنی تاریخ لکھنی شروع کی اور تاریخی شواہد کی بنیاد پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ان کی ذات کا شمار اونچی ذاتوں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ کھتری کشتری بن گئے اور کورمیز نے یہ دعویٰ کیا کہ ان کا تعلق کورما سے ہے جو کہ وشنو کا ایک روپ ہے چاروں نے اپنا اپنا تعلق برہمنوں سے نکالا تو نونیا (نمک بنانے والے) ذات نے اپنا رشتہ پرتھوری راج چوہان سے قائم کر لیا۔ اس رجحان کے بارے میں ۱۸۷۰ء کی دہائی میں ایک مصنف بھارت تبدو نے لکھا ہے کہ :

مختلف ذاتوں کے لوگ اپنی تاریخ کی تشکیل دینے میں مصروف ہیں۔ مثلاً دھسرا (Dhusara) جن کی وشینو ذات کے بارے میں بھی شبہ ہے کیونکہ وہ بیوہ کی شادی کی اجازت دیتے ہیں۔ انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ برہمن ہیں۔ کایستھ لوگوں نے (جو کہ شودر ذات سے ہیں) کشتری ہونے کا دعویٰ کر دیا اور جاٹوں کا بھی... کہتا ہے کہ وہ کشتری ہیں۔ اسی طرح سے تاریخ ان ذاتوں کے لئے وہ ذریعہ بن گئی کہ جس کے ذریعہ انہوں اپنی شناخت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کیا۔ اور اس کے بعد جب ان کا درجہ بلند ہو گیا تو انہوں نے اپنے حقوق کی بات کی۔

اس سلسلہ میں دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ہندو اور مسلمان نچلی ذاتوں نے خود کا تعلق اونچی اور اشراف کی ذاتوں سے کرنا چاہا تو اس پر ان دونوں ذاتوں کے لوگوں نے غم و غصہ کا اظہار کیا اور اکثر ان کا مذاق بھی اڑایا۔ مثلاً جولائے کہ جن کا سماجی مرتبہ بہت کم تر تھا۔ مبارک پور میں جو کہ یو پی کا ایک شہر تھا۔ ان کی علیحدہ مسجد تھی۔ وہ شہر کی جامعہ مسجد میں نماز تو پڑھ سکتے تھے مگر انہیں اجازت نہیں تھی کہ اگلی صف میں بیٹھیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ "اگر کوئی جولاہا دو دن نماز پڑھ لے تو وہ یہ سمجھنا

شروع کر دیتا ہے کہ وہ خدا کے پسندیدہ بندوں میں سے ہے" اس لئے اونچی ذات والوں نے اس پر اعتراض کیا اور کوشش بھی کہ نچلی ذات والوں کی اپنی تاریخ نہ ہو۔

ہندوستان کی تاریخ میں سماجی طور پر اس وقت تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں کہ جب یہاں برطانوی حکومت نے نمائندہ اداروں کو قائم کرنا شروع کیا اور نمائندگی حاصل کرنے کے لئے سیاسی راہنماؤں نے کیمونٹی کے جذبہ کو ابھارا۔ مثلاً سیاسی وجوہ کی بناء پر انیسویں صدی میں پہلی مرتبہ اچھوت لوگوں کو ہندو شمار کیا گیا۔ اور بعد میں انہیں بنیادوں پر ہندو اور مسلمان علیحدہ علیحدہ کیمونٹیز بنیں۔ ۱۹۲۰ اور ۱۹۳۰ء کی دہائیوں سے پہلے ہندوستان میں قومیت کا تصور یہ تھا کہ یہاں پر مسلمان، ہندو، سکھ، اور پارسی قومیں ہیں۔ اور کسی ایک ہندوستان قوم کا وجود نہیں لیکن اس کے بعد ہندوستانی قوم کا نظریہ پیدا ہونا شروع ہوا۔ اور اس بات پر زور دیا گیا کہ جو بھی ہندوستان میں رہتا ہے بلامذہبی تفریق کے وہ ہندوستانی ہے اس لئے تاریخ کو قومی نقطہ نظر سے پیش کرتے ہوئے ان حکمرانوں کو ابھارا گیا کہ جنہوں نے ہندوستان کو متحد کیا تھا۔ ان میں اشوک، اکبر وغیرہ شامل تھے۔ اور یہ اس تاریخ کی زوری تھی کہ اس نے اتحاد کی وجہ کو مغل، راجپوت، اور بدھسٹ حکمرانوں کو قرار دیا۔ اور لوگ یا عوام جو کہ تاریخ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ان کی خواہشات، منصوبوں اور عزائم کو نظر انداز کر دیا گیا اور نہ ہی ان کی مقامی وفاداریوں کو اہمیت دی گئی۔ اس طرح سے ہندوستانی معاشرہ میں جو قوم پرستی آئی اسے اوپر سے نازل کیا گیا، اور تاریخ کو قومی بنا کر اسے صرف ریاست کی تاریخ کا درجہ دیدیا گیا۔

نوآبادیاتی دور میں سامراجی مورخوں کا نقطہ نظریہ تھا کہ یہ صرف معاشرہ میں امن و امان برقرار رکھ سکتی ہے۔ مذہبی اختلافات کو ختم کر سکتی ہے۔ اور ہندوستان کو جدید دور میں داخل کر سکتی ہے۔ قوم پرستوں مورخوں نے بھی ریاست کی اہمیت پر زور دیا کہ صرف ریاست کے ذریعہ ماضی میں ہندوستان کا اتحاد قائم ہوا۔ اور مستقبل میں بھی ریاست ہی اس اتحاد کو برقرار رکھے گی۔ اس سے سیاسی رہنماؤں کا درجہ بلند ہو گیا۔ اور جس طرح ماضی میں اشوک اور اکبر نے لوگوں کی پس ماندگی دور کی تھی۔ اب یہ کام نہرو، پٹیل اور دوسرے راہنماؤں کا ہو گا کہ وہ لوگوں کو پس ماندگی سے نکالیں۔ اس طرح سے لوگوں کی اپنی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی۔

موپلا بغاوت

کسی بھی مورخ کے لئے یہ بہت مشکل ہوتا ہے کہ وہ ہم عصر تحریکوں کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ صادر کرے۔ کیونکہ اس وقت بہت سے حقائق نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں، اور بہت قریب ہونے کی وجہ سے واقعات کا گہرائی کے ساتھ تجزیہ بھی نہیں کیا جا سکتا ہے، اس لئے بعض اوقات جذبات کی بنیاد پر کوئی رائے دیدی جاتی ہے۔ یہی کچھ ہندوستان میں ہونیوالی موپلا بغاوت کے ساتھ ہوا، جنہوں نے ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی، بہت سے ہمعصر لکھنے والوں کی نظر میں یہ بغاوت دراصل مسلمان اور ہندوؤں کے درمیان فرقہ وارانہ جنگ تھی، جس میں کہ باغی موپلاؤں نے ہندوؤں پر مظالم ڈھائے، اور اس طرح اس جھگڑے نے ہندوستان میں اس وقت کے ہندو مسلم اتحاد پر کاری ضرب لگائی۔

اب جبکہ اس واقعہ کو گزرے ہوئے ستر سال گزر چکے ہیں، تو اس دوران میں بہت سے حقائق، حکومت کی رپورٹوں، بیانات، اعلانات، اور لوگوں کے انٹرویوز کے ذریعہ سامنے آئے ہیں، اور اس لئے ایک برطانوی محقق کونراڈ وڈ نے، موپلا بغاوت اور اس کی وجوہات، پر کتاب لکھی ہے تاکہ حقائق کو معروضی انداز میں تجزیہ کر کے بغاوت کی صحیح تصویر پیش کی جائے۔

اس نے تاریخی طور پر جنوبی مالابار میں کہ جہاں موپلا آباد ہیں، ان کے اور ہندوؤں کے درمیان تعلقات کا مطالعہ کیا ہے، اور اس کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء کی بغاوت کو فرقہ واریت کی جنگ کہنا غلطی ہے، کیونکہ درحقیقت اس کی جڑیں مذہب میں نہیں تھیں بلکہ ان کا تعلق معاشی و سماجی حالات سے تھا، اور جب یہ جھگڑا شروع ہوا اور اس نے بغاوت کی شکل اختیار کی تو باغیوں نے مذہب کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا تاکہ اس کے ذریعہ لوگوں کو بغاوت پر ابھارا جائے، اور ایک طرف برطانوی امپیریل ازم اور دوسری طرف ہندو زمیندار سے لڑا جائے۔

کونراڈ وڈ نے موپلاؤں کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کی جانب اشارہ کیا ہے کہ یہ مقامی لوگ تھے جو مسلمان ہوئے اور ان کی مالا بار میں آبادی ۳۲ فیصد تھی ان کی مادری زبان ملیالم تھی، اور پیشہ کے اعتبار سے یہ کسان تھے۔ ان کے علاقہ پر تاریخ میں مختلف ہندو راجاؤں نے حکومت کی، مگر پھر وقتی طور پر یہ علاقے میسور کی ریاست کے قبضہ

میں آ گئے اور حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے ان پر حکومت کی۔ اس زمانہ میں موپلا کسانوں کو یہ مواقع ملے کہ وہ اپنی معاشی حالت کو بہتر بنائیں۔ اور اپنا سماجی رتبہ بلند کریں' اور ساتھ میں ہندو زمیندار جو کہ جنمی کہلاتے تھے ان کے استحصال سے خود کو آزاد کریں۔ جنمی ہندوؤں نے ٹیپو سلطان کے دور حکومت میں کہ جب ان پر دباؤ پڑا' تو انہوں نے اپنی زمینیں چھوڑ دیں اور ہمسایہ علاقوں میں ہجرت کر کے چلے گئے' جب ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کو شکست ہوئی' تو یہ جنمی زمیندار دوبارہ سے جنوبی مالابار میں چلے آئے' اور اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان کی مدد کی تاکہ وہ اپنی چھوڑی ہوئی زمینوں پر دوبارہ سے قابض ہو سکیں۔ اس پالیسی کے خلاف موپلاؤں نے ۱۸۰۰ اور ۱۸۰۲ء میں بغاوت کی۔

اس طرح سے موپلاؤں کی بغاوت کی ابتداء میں اس وقت سے ہوتی ہے کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی ان علاقوں میں اپنے اقتدار کو مستحکم کر رہی تھی' اور س وقت سے وہ انگریزی حکومت کو اپنے مفادات کے خلاف سمجھنے لگے تھے' اس لئے کمپنی کی سیاسی طاقت اور ہندو زمیندار کی معاشی طاقت و استحصال کے خلاف ان کی مزاحمت شروع ہوئی۔

برطانوی انتظامیہ اور اس کے افسروں نے موپلاؤں کے اس مخالفانہ رویہ کی وجہ سے ان کے بارے میں جو رائے قائم کی وہ یہ تھی کہ "موپلا بدترین قوم ہے" "برطانوی حکومت کی سخت مخالف ہے" ان پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہے" اس کے بعد "موپلا انتہا پسندی" کی اصطلاح ان کے لئے کثرت سے استعمال ہونے لگی اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان اقوام یا جماعتوں اور گروہوں نے کہ جنہوں نے انگریزوں سے تعاون نہیں کیا' انہیں انگریزوں نے اپنے بدترین دشمنوں کی حیثیت سے پیش کیا' اور ان کی مزاحمت کو سختی سے کچلا۔ ان کی جانب سے ایسی بہت کم کوششیں ہوئیں کہ ان کے مسائل کو سمجھا جائے' اور ان کا کوئی حل تلاش کیا جائے۔

اس وجہ سے موپلاؤں نے بار بار بغاوتیں کیں' ان میں ۱۸۳۶ء اور ۱۹۱۹ء کی بغاوتیں مشہور ہیں' لیکن ان سب بغاوتوں میں سب سے زیادہ مشہور اور اہم بغاوت ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء کی تھی' یہ بغاوت اس وقت شروع ہوئی جب کہ ہندوستان میں خلاف تحریک اور تحریک عدم تعاون جاری تھیں' اور ان دونوں تحریکوں میں ہندو و مسلمان متحد ہو رہے تھے۔ اس لئے موپلاؤں میں اس قسم کی افواہیں پھیلنا شروع ہو گئیں کہ غیر ملکی حکومت ختم ہونیوالی ہے۔ اس لئے انہیں یہ حوصلہ دیا کہ حکومت کے بغاوت کر کے اپنی حکومت قائم کریں۔ دیکھا جائے تو برطانوی دور حکومت میں ۱۸۵۷ء کے بعد یہ سب سے زیادہ خطرناک بغاوت

تھی کہ جس نے برطانوی حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔ اور حکومت کو اپنی پوری توجہ اس کی طرف کرنی پڑی تاکہ اس کو ختم کر کے دوبارہ سے حکومت کی ساکھ کو بحال کیا جا سکے۔

ان تمام بغاوتوں میں کہ جو موپلاؤں نے کیں' ان میں مذہب نے ایک اہم کردار ادا کیا۔ کیونکہ یہ بغاوتیں بنیادی طور پر مسلمان کسانوں اور ہندو زمینداروں کے درمیان ہوئیں' اس لئے ظاہری طور پر یہ فرقہ واریت کی شکل اختیار کئے ہوئے ہیں۔ کیونکہ ان بغاوتوں کے دوران موپلاؤں نے تبلیغ بھی کی اور ہندوؤں کو مسلمان بنانے کی کوششیں کیں۔ اس لئے یہ خیال تھا کہ ان کی بغاتوں پر مذہب کا غلبہ ہے۔ لیکن اگر ان بغاوتوں کا گہرائی سے مطالعہ کریں' تو اندازہ ہوتا ہے کہ موپلا معاشی اور سماجی استحصال کے خلاف مذہب کو بطور ایک آلہ اور ہتھیار کے استعمال کر رہے تھے' اور وہ اس پر اس لئے مجبور تھے کہ اس وقت ان کے سامنے کوئی سیکولر اور قومی نظریہ موجود نہیں تھا کہ جس کو وہ اختیار کر کے لوگوں کو متحدہ کرتے' جب کہ موپلاؤں کی اکثریت ان پڑھ تھی' اور مذہب کے بارے میں ان کی معلومات بہت کم اور سطحی تھیں۔ مگر بغاوتوں کو اخلاقی جواز فراہم کرنے کے لئے مذہب کا استعمال ہوا' اور مذہبی علامات کو بھی اختیار کیا گیا' مثلاً کفن پہن کر جنگ کے لئے جانا' تاکہ مرنے کے بعد شہید کا درجہ حاصل کیا جائے۔ اللہ اکبر کے نعرہ لگانا' تاکہ لڑنے کے لئے حوصلہ ہو' وغیرہ۔

جب بغاوت کے دوران وہ تبلیغ کرتے اور لوگوں کو مسلمان بنانے کی کوشش کرتے تو ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ حکومت غیر مسلموں کو ان کے خلاف استعمال نہ کر سکے اور سب ایک مذہب کو اختیار کر کے متحد ہو جائیں' اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ وہ مسلمان جو کہ حکومت کے ساتھ تعاون کر رہے تھے جب وہ پکڑے جاتے تو باغی ان کو نئے سرے سے کلمہ پڑھوا کر انہیں دوبارہ سے اپنی جماعت میں شامل کر لیتے تھے۔

اس لئے بنیادی طور پر یہ بغاوتیں مذہبی نہیں تھیں' ان کی تحریک میں بہت سے غریب ہندو بھی تھے کہ جنہوں نے ہندو جاگیرداروں کی جائدادوں کی لوٹ میں حصہ لیا' جب کہ بہت سے مسلمان تھے کہ جنہوں نے حکومت کے ساتھ تعاون کیا۔

درحقیقت موپلاؤں کی بغاوت کسانوں' کاشتکاروں' اور دیہی علاقہ کے رہنے والوں کی بغاوت تھی کہ جو برطانوی نوآبادیاتی نظام اور اس کے ساتھ تعاون کرنے والے زمینداروں کے خلاف تھی' اور اس لئے اس نے اس نظام کی بنیادوں کو کمزور کیا' اور ہندوستان کی آزادی میں اس طرح سے بلاواسطہ حصہ لیا۔

گاندھی اور ہندوستان کی سیاست

بی۔ آر۔ نندا نے "گاندھی' پان اسلام ازم' اور نیشنل ازم" کے عنوان سے کتاب میں گاندھی کی سیاست کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی تحریکوں' اور ہندو مسلمان اتحاد' اور اس کے ٹوٹنے کا مطالعہ کیا ہے' اور خاص طور سے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ہندوستان میں' انگریزوں کی حکومت کے قائم ہونے کے بہت بعد میں جب نمائندہ ادارے قائم ہونے شروع ہوئے تو اس وقت مسلمانوں کو احساس ہوا کہ بحیثیت [illegible]یت کے وہ ان نمائندہ اداروں میں موثر کردار ادا نہیں کر سکیں گے' اور اسی احساس نے ان میں مسلم شناخت کو پیدا کیا' اور یہی وہ احساس تھا کہ انہوں نے اپنی تاریخ اور ماضی کو نئے سرے سے اور نئے زاویہ سے دیکھا۔

مسلمانوں میں سیاسی و سماجی بیداری کا کام سر سید احمد اور ان کی علی گڑھ تحریک نے شروع کیا تاکہ مسلمان تبدیلیوں کو سمجھتے ہوئے ان میں خود کو ڈھال سکیں' مسلمانوں کی ابتدائی لیڈرشپ جس میں سر سید' محسن الملک اور وقار الملک شامل تھے' اس کی یہ خصوصیت تھی کہ یہ لوگ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں معمولی عہدوں پر کام کر چکے تھے' اور اس حیثیت سے ان میں برطانوی حکومت کا ڈر' اور احترام تھا' اور اسی لئے یہ ۱۸۵۷ء کے تجربہ کے بعد برطانوی حکومت سے کسی مزاحمت کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے' اور اس کے ساتھ وفاداری اور اطاعت گذاری کے ساتھ رہنا چاہتے تھے۔

اس کے برعکس بعد کی نسل جو برطانوی دور میں' یورپی تعلیم کے بعد ابھری' جن میں دادا بھائی نوروجی' فیروز مہتا' سرندر ناتھ بنیر جی' اور گوکھلے تھے' انہوں نے آزاد پیشوں کو اختیار کیا' جس میں وکالت کا پیشہ مقبول تھا' اس لئے یہ لوگ اپنی آزادی اور خود مختاری کو برقرار رکھ سکے اور حکومت سے اپنے حقوق کے لئے مطالبات بھی کئے۔

سر سید نے اگرچہ مسلمانوں کو ایجی ٹیشن کی سیاست سے دور رکھنا چاہا' مگر انہوں نے مسلمان طالب علموں کو یورپی اور مغربی تعلیم کے ذریعہ روشن خیال بنانے کی کوشش کی' اور ساتھ ہی میں یہ بھی کوشش کی کہ ان میں مذہبی تعصب پیدا نہ ہو' لیکن سر سید کے بعد علی گڑھ قدامت پرستی اور راسخ العقیدگی کی طرف چلا گیا' اور اس میں وقار الملک کا ہاتھ تھا جو کہ علی گڑھ کے ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۲ء تک سیکرٹری تھے' ان کے زمانہ میں اگر کسی طالب علم سے نماز چھوٹ جاتی تھی تو اسے کالج سے خارج کر دیا جاتا تھا۔ انہوں نے ایک لڑکے کو

اس لئے داخلہ نہیں دیا کہ اس کے والدین اس کے لئے نماز کی حاضری اختیاری کرانا چاہتے تھے۔ انہوں نے سنیوں کے لئے علیحدہ مولوی مقرر کئے' اور شیعوں کے لئے علیحدہ جگہ دی۔ انہوں نے کالج میں ڈرامے بند کرا دیئے۔ اس کے نتیجہ وہ علماء جو سر سید کے زمانہ میں کالج کے مخالف تھے' اب اس کے حامی ہو گئے' اور وعظ و تقریروں کے لئے یہاں آنے لگے۔

مسلمانوں کی سیاست اس دور میں آہستہ آہستہ مذہب کی طرف مائل ہوتی گئی اور مذہب میں بھی قدامت پرستی کی طرف' شبلی نے سر سید سے علیحدہ ہو کر ندوۃ العلماء کی بنیاد ڈالی' اور اس بات پر زور دیا کہ مسلمانوں کی راہنمائی کا حق صرف انہیں ہی ہے' اور یہ حق بھی انہیں ہی ہے کہ وہ اسلام کی تعبیر و تفسیر کریں۔

علی گڑھ کالج مزید قدامت پرستی کی طرف اس وقت آیا کہ جب ۱۹۰۴ء میں ڈینی سن راس' جو کالج کے پرنسپل تھے انہوں نے یہاں عربی زبان کا شعبہ شروع کیا' اور اس کے پس منظر میں ان کا خیال تھا کہ اس طرح سے علی گڑھ کے طالب علموں میں مذہب اور قدامت پرستی اور گہری ہو جائے گی۔

لیکن بعد میں مسلمانوں کی جو نئی لیڈرشپ ابھری' وہ پرانی سے اس لئے مختلف تھی کہ یہ برطانوی حکومت سے وفاداری اور اطاعت کو چیلنج کر رہے تھے' کیونکہ اس وقت جو صورت حال تھی وہ یہ کہ بلقان کی جنگوں میں ترکوں کے خلاف برطانیہ اور یورپی اقوام نے جو رویہ اختیار کیا' اس سے یہ انتہائی مایوس ہوئے' اس لئے انہوں نے کھل کر برطانیہ کی مخالفت کی' اور برطانوی حکومت کے خلاف کانگریس سے اتحاد کرنا مناسب سمجھا' یہی وہ حالات تھے کہ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کا معاہدہ ہوا' تاکہ ہندو و مسلمان مل کر انگریزی راج کے خلاف جدوجہد کر سکیں۔ جب پہلی جنگ سے پہلے خلافت تحریک چلی تو اس میں مسلمان راہنماؤں نے برطانیہ کے خلاف اقدامات اٹھاتے ہوئے ہندوؤں سے اتحاد کر لیا۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ جب گاندھی ہندوستان کی سیاست میں آئے' گاندھی کے آنے سے پہلے' ہندوستان کے راہنماؤں کا جو لائحہ عمل تھا وہ یہ کہ آہستہ آہستہ برطانوی حکومت سے قانون ساز اسمبلیوں میں نشستیں لی جائیں' اور منتخب نمائندوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ گاندھی نے آنے کے بعد ہندوستان کی سیاست میں عوام کو بھی شامل کیا' چنانچہ اس سلسلہ میں پہلی ہڑتال رولٹ بل کے خلاف تھی جو ۶/ اپریل ۱۹۱۹ء کو ہوئی' اس میں پورے ملک میں لوگوں نے ہڑتال کر کے اپنی شمولیت کا اظہار کیا۔

گاندھی نے عدم تعاون کی تحریک اور خلافت دونوں کو ساتھ ملا کر اس بات کی کوشش کی کہ ہندو۔ مسلم اتحاد بڑھے اور سیاسی طور پر دونوں مل کر جدوجہد کریں' اس جدوجہد میں مسلمانوں کا امراء کا طبقہ بالکل علیحدہ رہا' کیونکہ وہ کسی بھی صورت میں حکومت کی ناراضگی نہیں چاہتے تھے' مگر علماء نے اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور خلافت تحریک کی راہنمائی پر قبضہ کر لیا' اور صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے شریعت کورٹ قائم کر کے' اور زکوۃ کو وصول کر کے اپنی علیحدہ سے ریاست بنا ڈالی

ہندو۔ مسلمان اتحاد اور تحریک میں اس وقت دراڑیں پڑیں کہ جب ۱۹۲۱ء' اور ۱۹۲۲ء میں موپلا بغاوت ہوئی' اور ۱۹۲۱ء میں بمبئی میں فسادات ہوئے' اور جب چورا چوری کے واقعہ کے بعد کہ جس میں مجمع نے تھانہ کو آگ لگا کر کچھ پولیس والوں کو زندہ جلا دیا تو گاندھی نے تحریک ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

یہ تحریک اس لئے بھی کمزور اور ناکام ہوئی' کیونکہ ۱۹۲۴ء میں مصطفے کمال نے خلافت کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا' اس کے بعد مسلمانوں کے لئے اس مقصد کے لئے جدوجہد کا کوئی سوال باقی نہیں رہا' دوسرے خلافت کمیٹی کے ممبران نے عوام کے چندوں میں جو خوردبرد کی تھی وہ لوگوں کے سامنے آئی' اور ان کا اعتماد اس پر سے بالکل اٹھ گیا۔

اس کے علاوہ تحریک عدم تعاون میں زیادہ متوسط طبقہ کے لوگ تھے' جن میں وکیل' چھوٹے تاجر' ملازم' اور اساتذہ و ڈاکٹر شامل تھے' یہ لوگ ایک طویل جدوجہد میں شامل ہونے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے' کیونکہ اس صورت میں ان پر بہت زیادہ مالی بوجھ پڑتا' اور گاندھی کسی بھی صورت میں اس پر تیار نہیں تھا کہ تحریک کی راہنمائی عوام کے ہاتھوں میں چلی جائے' اور پھر یہ پرتشدد صورت اختیار کرے' اس لئے اگرچہ عدم تعاون اور خلافت تحریک کے خاتمہ نے وقتی طور پر تحریک کو نقصان پہنچایا۔ مگر اس سے تحریک ختم نہیں ہوئی' بلکہ ان تجربات سے جو کچھ سیکھا' اس کے نتیجہ میں یہ زیادہ موثر بن کر ابھری۔

شہر کی کچی آبادیاں

پاکستان کے بڑھتے ہوئے مسائل میں سے ایک بڑا مسئلہ شہروں کی آبادی ہے' جس تیزی کے ساتھ شہر بڑھ رہے ہیں اتنی تیزی کے ساتھ ان مسائل کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کی جا رہی ہے' شہر کی آبادی کے ساتھ جو مسائل پیدا ہوتے ہیں ان میں مکان' ٹرانسپورٹ' تعلیم' صحت' بجلی' ایندھن' اور روزگار شامل ہوتے ہیں۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ آبادی کے اضافہ اور شہر کی سرگرمیوں کے ساتھ ہی شہر کا ایک خاص کلچر پیدا ہوتا ہے اسی کلچر میں نفسیاتی طور پر دباؤ کا شکار لوگ منشیات کے ذریعہ سکون حاصل کرتے ہیں' تو دوسری طرف محروم لوگ جرائم کے ذریعہ اپنی محرومیوں کو دور کرنا چاہتے ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد سے شہروں کی سماجی' ثقافتی' معاشی' اور سیاسی ڈھانچہ میں ایک زبردست تبدیلی آئی ہے' جب تک شہر چھوٹے تھے اور لوگ محلوں میں ایک طویل عرصہ سے آباد تھے اس وقت تک سماجی تعلقات بڑے گہرے تھے' لوگ ایک دوسرے سے ملتے تھے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ ایک طویل عرصہ سے ایک ہی محلے میں رہنے کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کے باپ دادا اور خاندان کو جانتے تھے' اور محلے کے بزرگ یہ اپنا فرض سمجھتے تھے کہ وہ بچوں اور نوجوانوں کے کردار پر نظر رکھیں۔ محلہ میں چوری اور جرائم بہت کم ہوتے تھے اور جس کا بھی کردار معاشرے کی معیاری قدروں کے مطابق خراب ہوتا' اس کا معاشرے اور محلہ میں عزت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن یہ سارا منظر اب بالکل تبدیل ہو گیا ہے' خصوصیت کے ساتھ تقسیم کے بعد پاکستان کے شہروں کا ڈھانچہ بالکل بدل گیا' کراچی' لاہور' پنڈی' اور حیدر آباد میں جو لوگ ہجرت کر کے آئے ان کی ایک بڑی تعداد شہروں میں آباد ہوئی محلوں کو وہ روایتی تصور بدل گیا' خاندان واقفیتیں ختم ہو گئیں' اور نئے تعلقات اب نوجوان نسل کے درمیان قائم ہوئے پرانی نسل کو اس ہجرت نے بالکل بے کار کر کے ایک طرف کر دیا' نئی نسل کو پہلے کے مقابلہ میں زیادہ مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے تعلیم' اور ملازمت و روزگار ان کے ایسے مسائل ہیں۔ کہ جن کا حل معاشرے کے موجودہ ڈھانچہ میں نظر نہیں آتا۔ اور پھر ان مسائل کو بڑھانے میں شہروں میں ناپید ہوتی ہوئی سہولتیں اور تفریحیں ہیں: ایک وقت تھا کہ شہروں میں کھلی جگہیں ہوتی تھی' باغات' کھیل کے میدان' اور شہر کے اردگرد کھیت یا جنگل' مگر

اب آہستہ آہستہ شہروں سے یہ سب چیزیں ناپید ہو رہی ہیں' ہر کھلی جگہ کو پلاٹ میں تبدیل کر کے اس جگہ پر دوکانیں اور فلیٹ بن رہے ہیں' اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کراچی اور حیدر آباد میں تقسیم سے پہلے کے جتنے باغات یا کھیل کے میدان تھے وہ سب ختم ہو چکے ہیں' شاید لاہور ایک ایسا شہر ہے کہ جہاں باغات میں اضافہ ہوا ہے' ورنہ پاکستان کے کسی اور شہر میں کھلی جگہوں کو بالکل ختم کر دیا گیا ہے- اس لوٹ کھسوٹ کی ایک بڑی وجہ حکومتوں کی سیاسی رشوت ہے جو کہ پلاٹوں کی صورتوں میں سیاسی حریفوں اور دوستوں کو دی جاتی ہے' اس لئے ہر نئی حکومت آنے کے بعد پہلا کام یہ کرتی ہے کہ کون کون سے پلاٹ خالی ہیں' اس کے نتیجہ میں نئی آبادیوں میں وہ سارے پلاٹ جو کہ باغات' اسکولوں' کالجوں یا عوام کی تفریح کے لئے تھے وہ سب سیاسی رشوت میں دے دیئے جاتے ہیں-

ایک زمانہ تھا کہ اسکول کی عمارت کے ساتھ ساتھ کھیل کے میدان ضرور ہوتے تھے' اب یہ سہولت چند پرانے اسکولوں میں باقی ہے مگر نئے اسکول یا تو اب بنگلوں میں کھل رہے ہیں یا پھر کواٹروں میں کہ جہاں بچوں کو کھیلنے' بھاگنے' اور حرکت کرنے کے کوئی مواقع دستیاب نہیں ہیں-

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بڑے شہروں میں اب لوگوں کی تفریح کے مواقع بالکل ختم ہو کر رہ گئے ہیں- ان کے گھر کے قریب نہ تو باغات ہیں- اور نہ ہی کوئی ایسی جگہ کہ جہاں شہر کے شور و غل سے دور جا کر وہ سکون کے چند گھنٹے گذار سکیں-

آبادی کے اضافہ کی وجہ سے سب سے زیادہ مسائل ان بستیوں اور آبادیوں میں ہیں کہ جہاں نچلے اور متوسط طبقے کے لوگ آباد ہیں' جن مکانوں میں تقسیم کے بعد ایک خاندان آباد تھا' اب ان گھروں میں دو یا تین تین خاندان آباد ہیں اس کا حل یہ نکالا گیا تھا کہ جہاں تک ممکن ہوا' کمرہ پر کمرہ بنایا گیا' مگر اب بعض جگہ اوپر جانے کے بھی امکانات نہیں رہے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کراچی میں پاپوش نگر' لیاقت آباد' اور گولیمار کے علاقوں میں بچوں اور نوجوانوں کو گھروں میں بیٹھنے کو جگہ نہیں' اتنی جگہ نہیں کہ وہ بیٹھ کر اسکول کا کام کر سکیں یا پڑھ سکیں' اس وجہ سے ان کی اکثریت اس پر مجبور ہے کہ وہ دن بھر گلیوں میں آوارہ گردی کریں اور رات کو محض سونے کے لئے گھر آئیں- ان کے آس پاس کوئی ایسی جگہیں نہیں کہ جہاں یہ تفریح کے لئے جا سکیں' نہ لائبریری' نہ یوتھ کلب' اور نہ ہی باغ اور میدان' اس لئے جب بھی ان علاقوں میں ہنگامے ہوتے ہیں تو یہ لوگ آسانی کے ساتھ ان میں ملوث ہو جاتے ہیں' کیونکہ ہنگامے نہ صرف ان کو دلچسپی کے مواقع

فراہم کرتے ہیں بلکہ ان کی اہمیت و حیثیت کو بڑھا دیتے ہیں' پولیس یا فوج سے مقابلہ کرنا اور اسے پسپا کر دینا ان کے لئے باعث فخر ہوتا ہے' اس لئے کراچی میں لالو کھیت یا لیاقت آباد کے باشندوں کو فخر ہے کہ ان سے کوئی نہیں جیت سکتا-

اس لئے بڑے شہروں میں ہنگاموں اور فسادات کا مرکز ایسے علاقے ہوتے ہیں کہ جہاں آبادی زیادہ ہو' مکانات چھوٹے ہوں' گلیاں تنگ ہوں' راستے پیچیدہ ہوں' ان علاقوں میں نوجوانوں کی ٹولیوں کے لئے فسادات ایک مقصد لے کر آتے ہیں' اور جب ایک بار انہیں اس کی لذت پڑ جاتی ہے تو ان کی خواہش ہوتی ہے کہ یہ فسادات ہوتے رہیں- ان علاقوں کے نوجوان چونکہ زندگی میں مقصدیت سے خالی ہوتے ہیں اس لئے وہ ایسی مذہبی و سیاسی جماعتوں میں شامل ہونے پر تیار ہوتے ہیں کہ جو انہیں اہمیت دے تاکہ ان کی سماجی اور ثقافتی کم تری کو اس ذریعہ سے سہارا مل سکے- اکثر یہ انتشار زدہ نوجوان فاشسٹ تنظیموں کے لئے بہترین مواد ثابت ہوتے ہیں کہ جہاں انہیں ایک خاص ڈسپلن میں رکھ کر دیگر اہم کام ان کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں' اس لئے یہ بڑی وفاداری اور دل جمعی کے ساتھ ان تنظیموں کے لئے کام کرتے ہیں-

۲

پاکستان کے شہروں میں ریاست اور اس کے تمام ادارے اپنی اہمیت اور وقعت کھو چکے ہیں' کیونکہ ریاست کے اداروں کا عزت و احترام اور وقار اسی وقت تک ہوتا ہے جب تک کہ ان کی جڑیں عوام میں رہتی ہیں- اور عوام کے مفاد' ان کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرتے ہیں- لیکن جب ایک مرتبہ یہ ادارے لوگوں کے مفادات کا تحفظ کرنے کے بجائے عوام دشمن قوتیں بن جائیں تو اس صورت میں عوام اور ان اداروں کے درمیان ایک گہری خلیج حائل ہو جاتی ہے- اس کی مثال پولیس کے ادارے کی ہے- اس کے اولین مقاصد میں عوام کا تحفظ شامل ہے اور ایسے اقدامات کرنا ہیں کہ جن کی وجہ سے عوام کی جان و مال محفوظ رہے' خصوصیت سے شہروں میں کہ جہاں لوگ جرائم کی بڑھتی تعداد سے خوف زدہ ہیں' اور گھر کہ جس کو سب سے زیادہ محفوظ تصور کیا جاتا تھا وہ بھی اب محفوظ نہیں رہا- اس وجہ سے لوگوں میں پولیس کے ادارے کی کوئی اہمیت نہیں رہی ہے اور لوگوں کو یقین ہے کہ اکثر جرائم پولیس کی نگرانی میں ہوتے ہیں- اور پولیس بدعنوانیوں اور ناجائز کاموں میں پوری طرح سے ملوث ہوتی ہے اس لئے پولیس اور مجرموں کا گٹھ جوڑ ہو

گیا ہے' اور اس کے آگے لوگ خود کو بے سہارا اور مجبور پاتے ہیں' چونکہ ہمارے ملک میں جمہوری ادارے بھی مضبوط نہیں اس لئے لوگوں کے لئے ان پر تنقید کرنا' یا ان کی بدعنوانیوں کو سامنے لانے کا بھی کوئی ذریعہ نہیں۔ اخباروں کے ذریعہ بھی پولیس کے خلاف کچھ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جہاں پولیس اداروں سے رشوت لیتی ہے اخبار نویس پولیس والوں سے پیسہ لیتے ہیں۔ پھر کوئی بھی حکومت ہو وہ پولیس کے ادارے کا ہمیشہ دفاع کرتی ہے اور اس کی خرابیوں' بدعنوانیوں اور کمزوریوں کو دور کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتی

پولیس کی ناکامی کی وجہ سے مجرموں اور بدعنوان لوگوں کا طبقہ طاقتور ہو گیا' اور اپنی دولت کی وجہ سے اس نے اتنا اثر و رسوخ حاصل کر لیا کہ ان میں سے اکثر معاشرہ میں بڑے عزت دار اور محترم بن گئے ہیں ہیروئن اور سمگلنگ شریفانہ پیشے بن گئے ہیں۔ رشوت لینے پر اب کوئی شرمندہ نہیں ہوتا' قانون کی بالادستی کبھی کی ختم ہو چکی ہے' بلکہ قانون کو توڑنا اب ایک اچھی علامت بن گئی ہے' مثلاً یہ ایک فخر کی بات ہے کہ قانون تو اجازت نہیں دیتا تھا مگر مجھے یہ اجازت مل گئی۔ جرائم کی اس قدر بہتات ہوئی تو لوگ اب ان کے عادی بھی ہو گئے ہیں' ایک زمانہ میں چوریاں رات کے اندھیرے میں ہوتی تھیں مگر اب یہ ڈاکہ دن دھاڑے ہوتے ہیں' لوگوں کی کاریں' اور اسکوٹریں چھینی جاتی ہیں' عورتوں کے پرس ان سے کھینچ کر لے جائے جاتے ہیں مگر اب ان جرائم کے لئے نہ تو تعجب کے جذبات باقی رہے ہیں۔ اور نہ ان پر غم و غصہ کا اظہار ہوتا ہے۔ بڑے بڑے مجرم قومی لیڈر بنے ہوئے' تاریخ میں اپنے لئے جگہ بنا رہے ہیں۔

اس کے ساتھ ریاست کا دوسرا بڑا ادارہ نوکر شاہی بھی انتشار کا شکار ہے۔ ہر پبلک دفتر کے باہر دلالوں کا ایک ہجوم ہوتا ہے اور ان کے اپنے نرخ مقرر ہوتے ہیں' گاڑیوں کا لائسنس لینا ہو' یا بجلی' گیس و فون لگوانا ہو' ڈومیسائل بنوانا ہو یا شناختی کارڈ حاصل کرنا' ایک سلسلہ ہے کہ جس میں دلالوں کے ذریعہ کام جلدی اور فوری ہو جاتا ہے۔ اس لئے حکومت کے افسروں کی کوئی عزت و احترام نہیں کیونکہ یہ ایک ایسی شے بن گئے ہیں کہ جنہیں خریدا جا سکتا ہے۔

اور یہی کچھ حکومت کے دوسرے اداروں اور حکومت کی ذمہ داریوں اور فرائض کا ہے' کہ حکومت نہ تو تعلیم کی ضروریات پوری کر رہی ہے' نہ صحت کی ذمہ داری لیتی ہے' اور نہ ہی پبلک ٹرانسپورٹ کی طرف توجہ دیتی ہے۔ جب لوگوں کو ان کی بنیادی سہولتیں نہیں ملتی ہیں تو پھر وہ ان کے لئے دوسرے طریقے اختیار کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک

طریقہ تو باہمی تعاون کی بنیاد پر جماعتیں اور کلب بنانا ہوتا ہے تاکہ لوگ مل جل کر اپنی ضروریات کو آسانی سے پورا کریں' باہمی تعاون کی جماعتیں ہمارے ہاں بہت کم ہیں' کیونکہ یہ جماعتیں اسی وقت بنتی اور موثر ہوتی ہیں جب لوگوں کو ایک دوسرے پر اعتماد ہو' چونکہ ہمارے شہروں میں یہ اعتماد ختم ہے اس لئے ایسی جماعتیں بھی بہت کم ہیں۔ اور اگر بنتی بھی ہیں تو بہت تھوڑے وقت کے لئے' اس لئے اس خلا سے فائدہ اٹھا کر ان ضروریات کو پورا کرنے کے لئے تاجرانہ اور نفع کمانے کی بنیادوں پر ادارے شروع ہو گئے ہیں۔ حکومت تعلیمی ادارے نہیں کھول سکتی تو اس کمی کو پورا کرنے کے لئے نجی اسکول جگہ جگہ کھل گئے ہیں' اور لوگوں کی توجہ اور خواہش کے لئے اکثر اسکول انگلش میڈیم کے ہیں۔ اب اسکول کے بعد آہستہ آہستہ پرائیویٹ کالج اور یونیورسٹیاں بھی کھلنا شروع ہو جائیں گی' جب سرکاری ہسپتالوں سے دوائیں غائب ہو گئیں' اور مریضوں کو دیکھنے کے لئے ڈاکٹر نہ رہے تو نجی ہسپتال قائم ہونا شروع ہو گئے' اور بڑی بڑی فیسیں مقرر کر کے ماہرین طب نے اپنی دکانوں کو چمکانا شروع کر دیا۔ یہی صورت حال پبلک ٹرانسپورٹ اور دوسرے اداروں کی ہے کہ ہر جگہ حکومت کی جگہ نجی اداروں نے لے لی ہے۔ چونکہ ان نجی اداروں کا مقصد کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت کمانا ہے اس لئے ان کے نزدیک لوگوں کی خدمت یا لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنا کوئی مقصد نہیں ہوتا بلکہ ایک انسان ان کے لئے ایک شے ہوتا ہے کہ جس سے زیادہ سے زیادہ پیسہ حاصل کرنا مقصد ہوتا ہے۔

ان حالات کی وجہ سے شہروں میں انسانی تعلقات میں زبردست تبدیلی آئی ہے۔ خالص انسانی بنیادوں پر دوستی اور رشتے کمزور ہو گئے ہیں' اور تعلقات کی نوعیت محض تجارتی ہو کر رہ گئی ہے۔ لوگوں کی مجبوری پر ان سے ہمدردی کرنے کے بجائے ان سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہمارے معاشرہ میں یہ تبدیلی بڑے شہروں کے اندر سب سے زیادہ ہے چھوٹے شہر اور گاؤں اس تبدیلی سے زیادہ دوچار نہیں۔ شہروں میں زندگی کی رفتار جس تیزی سے ہے اسی تیزی سے لوگوں کی عادات اور رجحانات بھی بدل رہے ہیں۔ کلاسیکی موسیقی اب کہ جس میں نرم اور خوشگوار سکون ہے اس متلاطم دور میں پسند نہیں کی جاتی بلکہ اس کی جگہ ہنگامہ خیز اور شور مچانے والی متحرک موسیقی پسندیدہ بن گئی ہے۔ ادب میں رومانوی ناولوں یا کہانیوں کی جگہ جرائم کی کہانیاں پسند کی جانیں لگی ہیں' چونکہ اکثریت میں تعلیم ہی نہیں ہے اس لئے اب تفریح کا سب سے بڑا ذریعہ یا تو سینما ہیں۔ یا پھر وی۔ سی آر۔ بازاروں اور مارکیٹوں میں کتابوں کی دوکانیں نظر نہیں آتیں' اس کی جگہ یا تو

کپڑوں یا جوتوں کی دوکانوں کی اکثریت ہے یا پھر کھانے پینے کے اسٹالوں کی بھرمار ہے' کھال اترے ہوئے ننگے بکرے اور مرغے دوکانوں پر الٹے لٹکے ہوئے ہمارے ذوق اور کلچر کا ایک اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ایک طرف جہاں خوش پوش اور پیسے والے ان اسٹالوں پر سڑک کے کنارے کھانے میں مصروف ہوتے ہیں۔ تو وہیں ان کے سامنے بچے اور عورتیں اس کے منتظر رہتے ہیں کہ ان کا چھوڑا ہوا شاید انہیں مل جائے' ان کی گرسنہ نگاہیں ہر لقمہ کا پیچھا کرتی ہیں۔ مگر تعجب ہے کہ پھر بھی یہ لقمہ گلوں میں نہیں اٹکتے۔

۳

پاکستان کا ہر بڑا شہر اپنے اندر کئی شہر بسائے ہوئے ہوتا ہے۔ شہر کی بستیاں سماجی اور معاشی لحاظ سے تقسیم ہوتی ہیں۔ یہ تقسیم تین درجوں میں ہو سکتی ہے' طبقہ اعلیٰ' ان کی کوٹھیاں ۳۵ اور ۴ کنال سے لے کر ۳ کنال تک ہوتی ہیں' اس کے بعد متوسط درجہ کے لوگ آتے ہیں کہ جن کے مکان ۱ کنال سے ۱۰ مرلے تک کے ہوتے ہیں' اس کے بعد ۵ مرلے والے نچلے درجہ کے لوگ' اس تقسیم کے لحاظ سے ان آبادیوں کی سہولتیں ہوتی ہیں۔ امراء کی بستیوں میں باغات' سڑکوں کے کناروں پر درخت' اور خالی جگھوں پر سبزہ دل و نگاہ کو سرور بخش کا ہے' سڑکیں چوڑی' صاف ستھری ہوتی ہیں کوڑے کچرے کو باقاعدگی سے اٹھایا جاتا ہے' کم آبادی اور بڑے مکانوں کی وجہ سے ہر طرف خاموشی اور سکون ہوتا ہے' یہ سہولتیں دوسری دو بستیوں میں آتے آتے کم ہو جاتی ہیں' سڑکیں تنگ اور خستہ ہوتی جاتی ہیں' درختوں کے لگانے کی جگہیں باقی نہیں بچتی ہیں' ٹریفک کا شور و غل بڑھ جاتا ہے' کھلی جگہیں ختم ہو جاتیں ہیں' نالیاں اور گٹر ابلتے نظر آتے ہیں کوڑے کچرے کے ڈھیر جگہ جگہ لگے ہوتے ہیں کہ جنہیں کوئی اٹھانے والا نہیں ہوتا۔ بلکہ ہوا اور آنے جانے کی وجہ سے بکھرتا جاتا ہے' مکان چھوٹے اور تنگ ہونے کی وجہ سے گلیوں' بازاروں' اور سڑکوں پر لوگوں کا ہجوم نظر آتا ہے بچے گلیوں اور سڑکوں پر کرکٹ کھیلنے میں مصروف ہوتے ہیں زندگی کی لحہ بہ لحہ پورے زور شور سے جاری رہتی ہے۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر پھر شہر کی وہ کچی آبادیاں ہیں کہ جہاں سماجی لحاظ سے پس ماندہ اور کچلے لوگ رہتے ہیں اور جہاں بنیادی سہولتوں کا فقدان ہوتا ہے۔

ہر بڑے شہر میں' خصوصیت کراچی' لاہور' حیدر آباد' اور پنڈی میں ان کچی آبادیوں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے' ان کو آباد کرنے والے وہ لوگ۔ ہیں کہ جو دیہاتوں اور گاؤں سے

ملازمت اور معاش کی تلاش میں مسلسل شہروں میں آ رہے ہیں۔ یہ لوگ جب دیہات اور چھوٹے گاؤں سے آتے ہیں۔ تو اپنے ساتھ اپنی دیہاتی عادتیں اور دیہاتی کلچر کو لاتے ہیں' شہر میں آتے ہی انہیں سب سے پہلا اور بڑا جھٹکا یہ لگتا ہے کہ ان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں رہتی اور یہ شہر کے ہجوم میں گم ہو کر خود کو کھو دیتے ہیں۔ گاؤں میں ان کی سماجی کم تری کے باوجود کچھ حیثیت ہوتی ہے مگر شہر میں آنے کے بعد یہ ان سے چھین لی جاتی ہے' اور انہیں ہر طرف سے مخالفانہ رویوں کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔ شہر میں ہر نیا آنیوالا اپنی خواہشات ساتھ میں لاتا ہے' اس لئے جب ملازمت کی تلاش یا رہائش حاصل کرنے کی جدوجہد کرتا ہے تو اس کا مقابلہ اپنے ہی جیسے لوگوں سے ہوتا ہے' اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے کہ جیسے ریلوے تھرڈ کلاس ڈبے سے جو بھرا ہوا ہوتا ہے' ہر نئے سوار ہونے والے کو اندر داخل نہیں ہونے دیتا' مگر ایک مرتبہ جب وہ آ جاتا ہے تو پھر اسی تنگ جگہ میں وہ بھی اپنی جگہ بناتا ہے۔ نئے آنے والا کا چاہے وہ تنہا ہو یا خاندان کے ساتھ' سب سے بڑا مسئلہ رہائش کا ہوتا ہے' جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے۔ حکومت رہائش' صحت' تعلیم' ٹرانسپورٹ کے مسائل کو حل کرنے میں ناکام ہو چکی ہے۔ اور اسکی رہائشی جو اسکیمیں ہیں ان کا تعلق ان غربت اور بے گھر لوگوں سے بالکل نہیں۔ کیونکہ بڑے شہروں کی یہ اسکیمیں بھی تو بڑے بڑے قیمتی پلاٹوں کی ہوتی ہیں کہ جنہیں صرف دولت مند ہی خرید سکتے ہیں' دوسرے یہ کہ ان اسکیموں میں تمام کالا دھندا رکھنے والے پلاٹ خرید لیتے ہیں اور پھر وقت آنے پر انہیں مہنگے داموں فروخت کرتے ہیں اس لئے ان اسکیموں میں ان کے پلاٹ بہت کم ہوتے ہیں جو کہ خود مکان بنا کر رہنا چاہتے ہوں' اس لئے رہائش کی انتہائی ضرورت کے باوجود ان اسکیموں میں پلاٹ خالی پڑے رہتے ہیں۔ اور ان کے آباد ہونے میں دس سے بیس سال کا عرصہ لگ جاتا ہے۔

مکانوں اور پلاٹوں کی قیمتیں بڑھانے میں دوسرا اسٹیٹ ایجنسی والے کرتے ہیں' اپنے کمیشن کو بڑھانے کی خاطر یہ قیمتیں بڑھاتے رہتے ہیں' اور مصنوعی طریقوں سے مکانوں اور پلاٹوں کو مہنگا کرتے چلے جاتے ہیں کہ جس کی وجہ سے ایک عام آدمی کے لئے پلاٹ یا مکان خریدنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ لیکن رہائش انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے' اس لئے جب یہ ضرورت قانونی طریقے سے پوری نہیں ہوتی تو اسے غیر قانونی طریقوں سے پورا کیا جاتا ہے شہروں میں کچی آبادی کے وجود میں آنے کا جو عمل ہوتا ہے وہ اس طرح سے شروع ہوتا ہے کہ پہلے زمین پر قبضہ کیا جائے' پھر مکان تعمیر کیا جائے اور اس کے بعد ان

کی ملکیت کے حقوق کے لئے جدوجہد کی جائے۔ دوسری صورت میں جو کہ قانون ہوتا ہے اس میں پہلے ملکیت کے قانونی کاغذات حاصل کئے جاتے ہیں' پھر زمین حاصل کی جاتی ہے اور آخر میں اس پر مکان بنایا جاتا ہے۔ زمین پر قبضہ کرنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ بے گھر لوگ' یا ایک خاندان اور برادری والے مل کر یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ریاست کی اس زمین پر قبضہ کیا جائے کہ جو بنجر اور بیکار ہو اور شہر سے دور ہو۔ اکثر یہ زمینیں ریلوے لائنوں کے کنارے یا قبرستانوں' یا اگر پہاڑیاں ہوں تو اس کے اوپر' یا حکومت کی اسکیموں کی غیر آباد بستیوں میں ان جگہوں پر جو اسکول یا کالج وغیرہ کے لئے چھوڑی گئی ہوں قبضہ اچانک کیا جاتا ہے رات کے وقت یا چھٹی کے دن' اور فوری طور پر لوگ جگہ گھیر کر اپنی جھونپڑیاں بنا لیتے ہیں' پولیس یا قانونی کارروائی سے بچنے کے لئے پہلے سے تیاری کی جاتی ہے یا تو رشوت کے ذریعہ کام لیا جاتا ہے یا وکیل کو تیار کر کے مقدمہ عدالت میں داخل کر دیا جاتا ہے' اور اگر پولیس ان کی جگیوں کو ہٹانے کے لئے آتی ہے تو عورتیں بچے سامنے آکر رونا پیٹنا شروع کر دیتے ہیں تاکہ وہ سخت اقدامات سے گھبرائیں اکثر عورتیں افسروں کے قدموں پر گر کر خوشامد شروع کر دیتی ہیں۔ ان بستیوں کے نام اکثر صاحب اقتدار لوگوں کے نام پر رکھ دیئے جاتے ہیں' تاکہ پولیس اور دوسرے ادارے ان پر کارروائی کرتے ہوئے جھجکیں۔

قبضہ کے فوراً بعد ان آبادیوں کو قانونی درجہ دلانے کے لئے جدوجہد شروع کر دی جاتی ہے' لیکن جب تک ان کی قانونی حیثیت نہیں ہوتی اس وقت تک اس کے رہنے والے عدم تحفظ کا شکار ہوتے ہیں اور انہیں ڈر لگا رہتا ہے کہ انہیں بے دخل نہیں کر دیا جائے' اس لئے مکانوں کی تعمیر آہستہ آہستہ ہوتی ہے' اور صرف ضرورت کے لئے کمرے بنائے جاتے ہیں چونکہ یہ آبادیاں بغیر کسی منصوبہ اور پلان کے ہوتی ہیں اس لئے گلیاں تیڑھی میڑھی اور تنگ ہوتی ہیں' چونکہ حکومت کی بالکل ذمہ داری نہیں ہوتی اس لئے یہاں نہ نالیاں ہوتی ہیں' اور نہ کوڑا اٹھانے کی سہولت' اس وجہ سے یہ بستیاں ہر وقت گندے پانی اور کوڑوں کے ڈھیر میں چھپی رہتی ہیں' اس طرح بجلی' گیس' کی سہولتیں ناپید ہوتی ہیں۔ بستی سے کام پر جانے کے لئے کوئی پبلک ٹرانسپورٹ نہیں ہوتی' اس طرح اسکول' ہسپتال اور ڈاک خانہ وغیرہ بھی نہیں ہوتے لیکن مکان کے ہونے کی خواہش انسان میں اس قدر شدید ہوتی ہے کہ وہ ان تمام تکلیفوں اور پریشانیوں کو برداشت کرتا ہے اور اپنی رہائش کو برقرار رکھنے کی جدوجہد میں مصروف رہتا ہے۔ ان بنیادی سہولتوں کے لئے وہ جو اضافی قیمت دیتا ہے اس کی وجہ سے اس کے مکان کی قیمت بڑھ جاتی ہے' اور اسے قانونی بستیوں

کے مقابلہ میں زیادہ اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

عدم تحفظ کے احساس اور مکان کو قانونی درجہ دینے کی غرض کی وجہ سے کچی آبادی کے لوگ مختلف جماعتوں یا یونینوں میں متحد ہو جاتے ہیں' ان کا پہلا مقصد یہ ہوتا ہے کہ حکومت پر دباؤ ڈال کر نہ صرف ان آبادیوں کو قانونی درجہ دلایا جائے بلکہ حکومت سے بنیادی سہولتوں کے لئے مطالبہ کیا جائے۔ پاکستان میں کہ جہاں جمہوری حکوتوں کو وقت کم ملا' اور فوجی و آمرانہ حکومتیں اقتدار میں رہیں' ان کے دور میں کچی آبادیوں کو اسی طرح سے تحفظ ملا کہ یہ حکومتیں اپنے ناجائز وجود کو عوام میں مقبول بنانے کے لئے ایسے کاموں پر توجہ دیتی رہیں کہ جن سے ان کی جڑیں لوگوں تک چلی جائیں' ان کو اس بات کا ڈر رہتا تھا کہ وہ عوام میں نامقبول نہ ہوں' اس لئے ان کی کوشش ہوتی تھی کہ لوگ ہڑتال کرے اور جلوس و جلسہ نہ کریں' اور جہاں تک ہو سکے ان کے مطالبات مان لئے جائیں' اس لئے کچی آبادی کے لوگوں کی سیاسی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے ہر دور حکومت میں انہیں قانونی درجہ دیا گیا' اور اس طرح سے ان میں مقبول ہونے کی کوشش کی گئی۔

دوسرا موقع جو کچی آبادیوں کو قانونی درجہ دلاتا ہے وہ انتخاب کے وقت ہوتا ہے' اس وقت تمام سیاسی جماعتیں ان کی حمایت کرتی ہیں' اور ان کو قانونی دستاویزات دلانے کی جدوجہد کرتی ہیں' اس طرح سے ایک مرتبہ جو کچی آبادی قائم ہو جاتی ہے اسے جلد یا بدیر قانونی حیثیت مل ہی جاتی ہے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے بڑے بڑے لوگوں پر مشتمل ایک ایسا گروپ وجود میں آگیا ہے جو حکومت کی زمینوں پر قبضہ کرا کے کچی آبادیاں بساتا ہے' لوگوں سے پلاٹوں کے پیسے وصول کرتا ہے' اس گروپ کو ہم زمین غصب کرنے والا ہتھیانے والا کہہ سکتے ہیں۔

کچی آبادیوں کی بڑھتی تعداد جو سرکاری زمینوں پر آباد ہو رہی ہیں' حکومت کو یا ریاست کو اس زمین کا ایک پیسہ بھی نہیں ملتا اور یہ ساری رقم دلالوں کے یا سیاستدانوں کی جیب میں جاتی ہے' دوسری طرف بنیادی سہولتوں کے لئے بستی کے لوگ جو خرچ کرتے ہیں' اس کا منافع بھی حکومت کو نہیں ہوتا' اس طرح یہ صورت حال متوازن ریاستی اداروں کو بیدار کرتی ہے۔

رہائشی بستیوں کو اگر منصوبہ کے تحت بسایا جائے' ان میں بنیادی سہولتیں فراہم کی جائیں' تو اس صورت میں شہر کے رہنے والوں کی نفسیات بدل جائے گی' اور اگر شام کو کام سے واپسی پر اسے گھر میں سکون مل جائے تو پھر دوسرے دن نئی توانائی کے ساتھ کام کے

لئے تیار ہو جائے گا۔ لیکن اگر بسوں، اور ویگنوں میں دھکے کھانے کے بعد اسے گھر آکر پبلک نلکے سے پانی بھی بھرنا ہو، تو معمولی باتوں پر روزمرہ کی لڑائیوں پر تعجب نہیں کرنا چاہئے اس صورت میں مذہبی، نسلی، اور قبائلی جھگڑے بڑی آسانی سے پیدا بھی ہو سکتے ہیں اور یہ جلد ہی جڑ بھی پکڑ سکتے ہیں۔ اگر خاندانوں کو معاشی طور پر سکون ہو، اور انہیں سر ڈھانپنے کو جگہ میسر ہو تو پھر انسان فرصت کے لمحوں کو قتل و غارت گری میں خرچ نہیں کرنا چاہے گا وہ انہیں خوشی و مسرت کے لئے وقف کر دے گا۔

اس وقت پاکستان کے بڑے شہروں میں جو نسلی و مذہبی فسادات امنڈ پڑے ہیں ان کی ایک بڑی وجہ شہروں میں بنیادی سہولتوں کے فقدان ہے۔ ہمارے حکمران ان مسئلوں کا حل اکثر یہ ڈھونڈتے ہیں کہ جرائم کی روک تھام کے لئے پولیس کی تعداد بڑھا دی جائے اور فسادات کو روکنے کے لئے انہیں جدید ہتھیاروں سے مسلح کر دیا جائے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ حل سطحی ہیں۔ جرائم کو اسی وقت ختم کیا جا سکتا ہے جب کہ ان کی بنیاد کو ختم کیا جائے، مگر ان کی بنیاد کو اس لئے نہیں ختم کیا جا سکتا کہ اس صورت میں ہمارے حکمراں طبقوں کو اپنی بہت سی مراعات سے دستبردار ہونا پڑے گا، اور فی الحال وہ اس کے لئے تیار نہیں۔ دوسری صورت میں اگر یہی صورت حال جاری رہی اور لوگوں کے سامنے تبدیلی کے تمام راستوں کو بند کر دیا گیا تو اس نتیجہ میں سوائے پرتشدد تبدیلی کے اور کوئی دوسرا راستہ باقی نہیں رہے گا۔

کراچی کی کچی آبادیاں اور سماجی مسائل

یان فان ڈیرلنڈین

کراچی میں سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو یہاں پر غریب اور کم آمدنی کے لوگوں کی کچی آبادیاں ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ سات ملین آبادی میں تقریباً آدھی ان افراد پر مشتمل ہے جو قانونی ذرائع سے مکان حاصل نہیں کر سکتے ہیں، کیونکہ پلاٹوں اور مکانوں کی قیمتیں ان کی آمدنی کے تناسب سے بہت زیادہ ہیں، اور ان غریبوں کو قرض پر پیسہ بھی نہیں مل سکتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ان غریب لوگوں کی اکثریت رہائش کے حصول کے لئے غیر قانونی طریقوں کو اختیار کرتی ہیں۔ اگرچہ اس طرح سے زمین پر ناجائز قبضہ کر کے مکان بنانے میں بڑے خطرے ہوتے ہیں خصوصیت سے شروع سال میں، مگر مسئلہ یہ ہے کہ جب ان کے تمام راستوں کو بند کر دیا جاتا ہے تو اس صورت میں وہ ہر خطرہ لینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

چونکہ اس قسم کی غیر قانونی آبادیوں میں بنیادی سہولتوں کا فقدان ہوتا ہے اس لئے زندگی بڑی مشکل اور دشوار ہوتی ہے، اور ابتداء ہی سے ان کی ساری توجہ اس بات پر مرکوز ہوتی ہے کہ ۴۰ یا ۸۰ گز کے پلاٹ پر جس پر انھوں نے ناجائز طور پر مکان بنایا ہے اسے کس طرح سے قانونی بنایا جائے۔ مگر ان کی یہ جدوجہد مظاہروں، ہڑتالوں، یا نعروں کے ذریعہ نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ یہ کام وہ حکام بالا یا با اثر سیاسی جماعتوں کے راہنماؤں سے درخواستوں کے ذریعہ کرتے ہیں۔ مثلاً اس کا نمونہ یہ درخواست ہے:

جناب عالی!

ہم دستخط شدہ مہاجرین جو کہ دہلی سے ہجرت کر کے آئے ہیں بڑے ادب اور عاجزی سے درخواست کرتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک کو کم از کم سو گز کا ایک پلاٹ الاٹ کیا جائے۔ آپ کو اس بات کا پتہ ہو گا کہ ہم بڑے برے حالات میں اپنی جانیں بچا کر کراچی آسکے ہیں ہماری تمام جائدادوں اور سامان کو بری طرح سے لوٹا گیا، اور ہم خود انتہائی مصیبتوں کے بعد خدا کے فضل وکرم سے آپ کے شہر میں آئے ہیں اور اب یہاں رہائش کے لئے سرگرداں ہیں۔

یہ ان مہاجرین کی درخواست کا ایک حصہ ہے جو ۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے کراچی

آئے تھے۔ اس درخواست کا جو لہجہ اور انداز ہے وہ ۱۹۷۴ء کی درخواست میں بھی وہی ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ یہ ایک درخواست ہے جو ایک بستی کے لوگوں نے پی پی پی کی برانچ کو دی تھی۔

جناب کی توجہ اس بات کی جانب دلائی جاتی ہے کہ معزز افسران نے مہربانی فرما کر ہمارے مسائل پر غور کیا اور ہر مسئلہ پر بستی کے معززین سے بات چیت کی اور تحمل کے ساتھ ان کی رائے کو سنا۔ ان کی اس مہربانی کی وجہ سے آبادی کے تمام لوگ ان کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہماری درخواست پر حالات کا مکمل جائزہ لیا اور ہمیں بے مثل اور قیمتی نصیحتوں سے نوازا' اس کے لئے ہم ان کے ممنون ہیں۔ آبادی کے تمام لوگ ان کی بے مثل اور قابل تعریف سلوک سے بے انتہا متاثر ہیں۔ اور ان کی آمد کیلئے شکرگزار ہیں

آخر میں "آپ کا تابعدار خادم" اور پھر اس کے بعد دستخط ہیں۔ ان دونوں درخواستوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں افسران کی عزت کا واضح طور پر اعلان کیا گیا ہے۔ ان دونوں درخواستوں میں ایک لفظ بھی اپنے حقوق کے بارے میں نہیں ہے' اور نہ ہی افسران کے خلاف کچھ ہے۔ ان درخواستوں کے متن سے اتھارٹی کی مراعات اور زیادہ مستحکم ہوتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ درخواستیں باقاعدہ لیٹر پیڈ پر ہیں۔ اور ان پر دستخط کرنے والے آبادی کے سرکردہ لوگ ہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہ درخواستیں گمنام اور معمولی لوگوں کی طرف سے پیش کی گئی ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ ان میں کہیں بھی حقوق کی بات نہیں کی گئی ہے۔ اس کے بجائے افسران سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ ان کا کام کر کے انھیں ممنون کریں۔ درخواستوں کے آخر میں یہ اضافہ بھی ہے کہ "جناب عالی کے مطالعہ کے لئے" "ہمدردانہ غور کے لئے" اور "ہمدردانہ احکامات کے لئے"

ان درخواستوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ رہائش کے حصول کے لئے یہ درخواستیں کسی ایجنسی کی طرف سے نہیں ہیں بلکہ لوگوں کی طرف سے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرہ کا نظام سرپرستی اور معاونت پر ہے اور اس نظام میں سرپرست وہ ہے جو کہ بااثر ہے اور لوگوں کا کام کرا سکتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں جن کا کام ہوتا ہے وہ اس کی ہر خدمت پر تیار رہتے ہیں۔ اس نظام میں یہ سرپرست اپنے سے زیادہ طاقت ور اور بااثر کے ماتحت ہوتے ہیں۔ اس طرح اس نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر ایک دوسرے کا محتاج ہو جاتا ہے۔ اس طرح سرپرست یہ نہیں چاہتا ہے کہ مسائل حل ہو جائیں کیونکہ

مسائل حل ہونے کی صورت میں اس کا اثر ورسوخ اور اہمیت ختم ہو جاتی ہے اس لئے ان حالات میں مسائل کو صرف جزوی اور عارضی طور پر حل کیا جاتا ہے۔

اب تک حکومت کی جانب سے ایسا کوئی باقاعدہ منصوبہ نہیں بنایا گیا کہ جس میں کم آمدنی والے لوگوں کو بسایا جا سکے۔ ہاں اس قسم کے پروگرام ضرور بنائے گئے کہ شہر کی کچی آبادیوں کو کس طرح فوری طور پر ختم کیا جائے۔ ایسے کوئی منصوبے کو جن کے ذریعہ کم آمدنی والے لوگوں کو بسایا جائے مکمل نہیں ہوے۔ اس کے مقابلہ میں ۶۰ کے قریب پبلک ایجنسیاں رہائش کے مختلف منصوبوں پر کام کررہی ہیں۔ مگر ان سب میں نہ تو ایک دوسرے سے کوئی رابطہ ہے اور نہ تعلق' اس وجہ سے اکثر متضاد قسم کے منصوبوں پر عمل ہوتا ہے۔

اس کی مثال جیکب لائنز کے منصوبہ سے دی جاسکتی ہے' جسے دوبارہ سے نئی شکل میں آباد کرنا تھا۔ سب سے پہلے تو وہ تمام منصوبے ناکام ہو گئے کہ جن میں یہاں کی آبادی کو کراچی کے دوسرے علاقوں میں آباد کرنا تھا۔ پھر یہ منصوبہ بنایا گیا کہ انھیں اس جگہ پر سستے فلیٹوں میں بسایا جائے مگر کے۔ ڈی۔ اے کے ماسٹرپلان شعبہ نے اسے رد کر دیا۔ دوسرا علاقے ترقی کا منصوبہ تھا جو جزوی طور پر ۸۰ کی دھائی میں پورا ہوا۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ منصوبہ بندی اور اس کے عمل درآمد کرنے میں نہ کوئی تعلق ہوتا ہے اور نہ رابطہ اور اس لئے یہ کامیاب نہیں ہوتا۔

اور اگر کوئی منصوبہ بنایا جاتا ہے تو اس کی پوری طرح سے وضاحت نہیں ہوتی مثلاً ۱۹۷۴ء میں کراچی کی ترقی کے لئے دس سالہ منصوبہ بنایا گیا۔ اس کی تعریف تو بہت کی گئی مگر اس کے نفاذ کے لئے جو رقم درکار تھی وہ پوری نہیں کی گئی اس طرح منصوبہ کے منتخب پہلوؤں پر عمل ہوتا ہے اور پورے منصوبہ پر کبھی کام نہیں ہوتا۔

جب کسی منصوبہ کے مختلف حصوں پر عمل کیا جاتا ہے تو اس سے حکومت کی مشنری اور وہ افسران جو اس میں ملوث ہوتے ہیں ان کے اثرات بڑھ جاتے ہیں اور صرف ان لوگوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں کہ جن سے انھیں یا حکومت کے سیاسی مقاصد کو فائدہ پہنچے غرضیکہ نوکر شاہی کا ذہنی انتشار۔ خراب حالات' غیرذمہ داری' اور ناقص منصوبہ بندی یہ سب مل کر کسی بھی منصوبہ کو ناکام کرتے ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں جب حکومت نے کچی آبادیوں کو قانونی درجہ رہا تو اس کے تجزیہ سے مندرجہ ذیل نتائج نکلے:

۱۔ کیونکہ کچی آبادیوں کو قانونی درجہ دینے یا ان کی ترقی کا کوئی واضح طریقہ کار موجود نہیں ہے اس لئے پبلک ایجنسیاں ترقی کی مخالفت کرتی ہیں۔ اور تمام منصوبہ بندی ناکام ہو جاتی

ہے

۲۔ منصوبہ بندی کا کام بہت دیر سے شروع ہوتا ہے اور غیر متعلق قوانین وضوابط کو اختیار کیا جاتا ہے اور آخر میں اوپر کے احکامات کے بعد تمام منصوبوں کو ختم کر دیا جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں سرپرستی کا عنصر اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اور یہ سرپرستی اس وقت ابھرتی ہے جب کہ حکومت کی مشنری اور ایجنسی موجود نہ ہو۔ اس وقت کوئی شخص اپنی ذاتی پسند کے مطابق حکومت کے ذرائع کو استعمال کر کے اپنی حیثیت کو مضبوط کرتا ہے۔

۱۹۷۰ کی دھائی میں حکومت نے پہلی مرتبہ کم آمدنی والے لوگوں کے مکانات کا منصوبہ بنایا پہلا کام یہ کیا گیا کہ غیر قانونی آبادیوں کو قانونی درجہ دیا گیا' اور پھر دوسرا کام یہ کیا گیا کہ مکانات کی تعمیر کے لئے زمین منتخب کی گئی۔ اس میں پہلا کام کے۔ایم۔سی کے ذمہ تھا۔ جبکہ دوسرا کام کے۔ڈی۔ کے۔ ان دونوں میں کسی قسم کے رابطہ کی گنجائش نہیں تھی' کچی آبادیوں کو قانونی درجہ دینے میں طویل عرصہ لگا۔ ۱۹۷۶ء میں اس کے قوانین بنائے گئے اور پھر آگے چل کر ایسے حالات ہوئے کہ مقامی حکام اس کی منظوری کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ پھر ۱۹۷۸ء اور ۱۹۸۰ء کے درمیان مارشل لاء حکومت نے کچی آبادیوں کو قانونی درجہ دینے کی منظوری دیدی اور اس کے بعد ان آبادیوں کو قانونی بنانے کے قوانین وضوابط بنائے گئے

کچی آبادیوں کی ترقی کے منصوبہ پر عمل درآمد ہونے میں بھی متضاد چیزیں سامنے آئیں مثلاً بلدیہ ٹاؤن کے کچھ حصوں میں تفصیلی منصوبہ بندی سے پہلے کچھ ترقیاتی کام ہو گیا' جب کہ دوسرے علاقوں میں کہ جن کا منصوبہ منظور ہو چکا تھا انھیں لمبے عرصہ کے لئے انتظار کرنا پڑا۔ ایک دوسری مثال غوثیہ کالونی کی ہے کہ جسے قانونی درجہ دینے کے بجائے مارشل لاء کے حکم کے تحت ہٹانے کا فیصلہ ہوا' مگر ایک سیاستدان کی مداخلت کی وجہ سے یہ نہ صرف قائم رہی بلکہ اسے فوری طور پر قانونی درجہ دینے کے احکامات بھی دیدئے گئے اور جلدی میں اس کے لئے قوانین بنائے گئے مگر اس سیاستدان نے قانون حیثیت کے کام کو چھ سال تک رکوا کے رکھا اگرچہ اسے فوری طور پر ہو جانا چاہئے تھا' لیکن سرپرست کا یہ ایک سیاسی حربہ تھا کہ اس کی وجہ سے لوگ اس کے قابو میں رہیں اور آخر میں وہ یہ ثابت کرے کہ ان کا کام محض اس کے اثر و رسوخ کی وجہ سے ہوا ہے ورنہ ایسا ہونا ناممکن تھا۔

اس مثال سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ پالیسیاں' قوانین وضوابط کی کوئی حیثیت نہیں

بلکہ یہ سرپرست ہوتا ہے جو فیصلے کراتا ہے اور ان پر عمل درآمد ہونے دیتا ہے اور رہا دوسرا مسئلہ کہ جس میں کم آمدن والوں کے مکانات کے لئے زمین کا تعلق تھا۔ تو اس کا یہ ہوا کہ تمام شور اور پروپگنڈے کے باوجود ۱۰۰۰۰ رہائشی پلاٹ جو کہ ان لوگوں کے لئے منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۵ء تک یہاں پر ۲۹۰۰ خاندان بسائے گئے' اور ان میں سے بھی یہ ان لوگوں کو ملے کہ جن کا اس منصوبہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

خاص طور سے جب کراچی کی بڑھتی ہوئی آبادی کو دیکھا جائے جو ۳ ملیون سے بڑھ کر ۷ ملیون ہو گئی ہے تو اس پس منظر میں کم آمدنی والے لوگوں کی رہائشی اسکیمیں نہ ہونے کے برابر ہیں اور جب ان لوگوں کو قانونی طور پر مکانات نہیں ملتے ہیں تو پھر یہ لوگ غیر قانونی طریقوں سے زمین حاصل کرتے ہیں۔ اور اس حالت میں تقریباً ۱۰۵ ملیون لوگ رہ رہے ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ کراچی کی سرکاری زمین کو نجی لوگوں نے اپنے درمیان تقسیم کر لیا ہے اس طرح سے حکومت اس قسم کی غیر قانونی کاروائی میں ملوث ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو وہ خود آبادکاری کے طریقے مہیا نہیں کرتی اور دوسری طرف جب لوگ غیر قانونی طور پر زمین پر قبضہ کر کے آباد ہو جاتے ہیں تو اسے بعد میں قانونی درجہ دیدیتی ہے اس طرح سے پبلک ایجنسیوں کے ملازمین اور سیاستدان حکومت کے ذرائع کو استعمال کر کے نجی فوائد حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً یہ حقیقت ہے کہ افسران اعلیٰ کی مرضی کے بغیر کوئی بھی کسی پلاٹ پر ناجائز طور پر قابض نہیں ہو سکتا ہے اکثر وہ یہ اجازت کسی بااثر شخص یا سیاستدان کے ذریعہ حاصل کراتے ہیں جس کے بدلے میں سیاستدان ووٹ اور سیاسی حمایت کو حاصل کرتا ہے اور اکثر ان سے مالی فوائد بھی حاصل کئے جاتے ہیں۔

اس حصہ میں میں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کم آمدنی والی ہاؤس اسکیموں میں جو کراچی کے لئے تھیں یا تو ان کی منصوبہ بندی سرے سے تھی ہی نہیں' اور اگر تھی تو بہت معمولی۔ دفتری کاروائیوں کی الجھنیں' غیر ضروری باتوں پر زور دینا اور پھر مختلف شعبوں میں کسی قسم کا ربط نہ ہونا ان سب کا فائدہ سیاستدانوں مقامی لیڈروں' اور افسران کو ہوا۔ اور انہوں نے سرپرست و ماتحتی کا ایک ڈھانچہ تیار کر لیا کہ جو ایک دوسرے کے فائدے کے لئے کام کرتا ہے۔ حکومت کی ایجنسیاں جب منصوبوں کو نافذ کرنے میں ناکام ہو گئیں تو وہ اس پر مجبور ہوئیں کہ وہ سرپرست اور سیاستدانوں کے مشوروں پر عمل کریں' لیکن جیسا

کہ ہم نے نشان دہی کی ہے یہ سرپرست مسائل کو حل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے' کیونکہ اگر مسائل حل ہو گئے تو ان کی حیثیت ختم ہو جائے گی۔

کچی آبادیوں میں رہنے والے لوگ فلاح و بہبود کی مقامی جماعتوں اور ان کے لیڈروں کا کوئی احترام نہیں کرتے۔ غوثیہ کالونی کے رہنے والوں سے میں نے جو بات چیت کی تو اکثر نے ان جماعتوں کو بے کار اور لا حاصل بتایا' اور اکثر نے کہا کہ ان کے لیڈر صرف پیسا کھانے کے لئے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ ان کے خیالات میں صداقت ہے۔

سب سے پہلے تو ایسی جماعتیں اکثر محض کاغذ پر ہوتی ہیں۔ اور ان کے نام اس قسم کے ہوتے ہیں "فلاں بورڈ" یا "فلاں کمیٹی" حالانکہ انہیں مقامی آبادی کی جماعت ہونا چاہئے' ان کے اراکین کی تعداد بھی کم ہوتی ہے اور یہی حال ان کے کام کا ہے۔ ان کے عہدے داروں کا خاص مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ وہ لوگوں میں ایک خاص مقام حاصل کر سکیں۔ جماعت میں تنظیم اور منصوبہ بندی پر تو بہت زور ہوتا ہے۔ مگر اس پر عمل بہت کم ہوتا ہے۔ اس لئے روز نئی جماعتیں بنتی ہیں۔ اور ختم ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک سروے کے ذریعہ پتہ چلا کہ ۴۵ فیصد کوئی کام نہیں کرتیں۔

ایسی جماعتیں صرف نسلی گروہوں تک محدود ہوتی ہیں' اور بہت زیادہ کامیاب جماعتیں بھی آبادی کے ایک حصہ کی نمائندگی کرتی ہیں۔ پھر ان جماعتوں میں زبردست مقابلہ ہوتا ہے اور دیکھا یہ گیا ہے کہ اکثر ایک جماعت دوسری جماعت کی سرگرمیوں کو روکنے میں اپنی توانائی ختم کر دیتی ہے۔ اس مقابلہ کی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان جماعتوں کی پہنچ ان ذرائع تک نہیں ہوتی کہ جو آبادی کی ترقی کے لئے ہیں' دوسری طرف ان لیڈروں کے ذاتی مفادات ہوتے ہیں اور وہ اس کوشش میں مصروف ہوتے ہیں کہ کسی طرح سے پبلک کے ذرائع پر قابض ہو جائیں کیونکہ اس اجارہ داری کے بعد ہی وہ اپنی سرپرستی کو قائم رکھ سکتے ہیں۔

جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے' اگر ان لیڈروں کا انتخاب ہوتا ہے تب بھی لوگ ایسے امیدواروں کو منتخب کرتے ہیں کہ جو بروکر ہوں' اس لئے لیڈرشپ کے لئے ان خصوصیات کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ ان لیڈروں کے مفادات اکثر آبادی کے مفادات سے مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر حکومت یہ اعلان کرتی ہے کہ کچی آبادی کو قانونی درجہ دیدیا جائے اور مکانوں اور پلاٹوں کو ان کے رہنے والوں کے نام لیز کر دیا جائے تو اس وقت لیڈروں اور آبادی کے مفادات میں تضاد نظر آتا ہے' کیونکہ یہ لیڈر

بڑے بڑے پلاٹ پر قبضہ کئے ہوئے ہوتے ہیں یا کئی پلاٹوں کے مالک ہوتے ہیں' لہٰذا ان کی کوشش ہوتی ہے کہ لیز کی فیس کم سے کم ہو' اس طرح یہ لیز اور ترقیاتی اخراجات کو علیحدہ علیحدہ کرا لیتے ہیں اس طرح سے وہ ایک طرف تو دونوں کو علیحدہ کرا کے آبادی پر اپنے اثر کو قائم رکھنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف ترقیاتی پروگرام کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے وہ ایک لمبے عرصہ تک اس عمل درآمد ہونے تک اپنی سیاست چمکاتے ہیں۔

مقامی لیڈر بھی سیاستدانوں کی طرح سے عمل کرتے ہیں' وہ منصوبہ پر مکمل عمل کرنے کے بجائے تھوڑا تھوڑا کر کے لوگوں کو دیتے ہیں' اور ان میں یہ احساس پیدا کرتے ہیں کہ یہ ان کا حق نہیں بلکہ یہ لیڈر کی مہربانی ہے کہ انہیں کچھ مل گیا ہے۔ ان لیڈروں کی طاقت کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کا رابطہ اور پہنچ وہاں تک ہوتی ہے کہ جہاں ترقیاتی منصوبوں کو بنایا جاتا ہے اور اس کے لئے پیسہ منظور کیا جاتا ہے کیونکہ ان منصوبوں کو کسی خاص قاعدے کے تحت نہیں بنایا جاتا اس لئے یہ وہاں اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہیں۔

مقامی آبادی میں لوگ اپنے سرپرست کے اس وقت تک محتاج رہتے ہیں جب تک کہ ان کے پلاٹ کو قانونی درجہ نہ مل جائے اور جب تک انھیں بنیادی سہولتیں مہیا نہ کر دی جائیں' چونکہ نوکر شاہی تک یہ لوگ پہنچ رکھتے ہیں اور عام آدمی تمام قوانین اور طرقوں سے ناواقف ہوتا ہے اس لئے اس کے پاس سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں ہوتا کہ وہ ان ایجنٹوں کے ذریعہ اپنا کام کرائے

جیسا کہ ہم نے بتایا' صورت حال یہ ہے کہ لوگ ان لیڈروں پر کوئی بھروسہ نہیں کرتے' بلکہ انھیں بخوبی اس کا احساس ہوتا ہے کہ یہ کس طرح سے ان کا استحصال کرتے ہیں' لیکن مجبوری یہ ہے کہ ان کے لئے اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ یہ دلال مکانات کے معاملات کے علاوہ دوسرے کاموں میں بھی مدد کرتے ہیں مثلاً ملازمت دلانا ہو' بچہ کو اسکول میں داخل کروانا ہو' یا اسپتال میں سفارش کی ضرورت ہو' اور یا پولیس سے نمٹنا ہو اس لئے عام لوگوں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ان سے اچھے تعلقات رکھیں' اگرچہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ ان کے ساتھ دھوکہ کرتے ہیں ان سے مفت میں پیسے وصول کرتے ہیں' مگر بہرحال انھیں تحفظ چاہئے اور ان کے الجھے ہوئے کاموں کو پورا ہونا چاہئے۔

اس صورت حال کا اندازہ ایک سروے رپورٹ سے بخوبی ہوتا ہے' کہ جس میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اکثریت نے کہا تھا کہ لیڈر کو امیر اور بااثر ہونا چاہئے تاکہ حکام

بالا سے اس کے اچھے تعلقات ہوں اور وہ لوگوں کو ضمانت پر رہا کرا سکے۔ لیڈر اور عام لوگ صرف اس وقت متحد ہوتے ہیں جب کہ ان دونوں کے مفادات کسی صورت حال میں ایک ہو جاتے ہیں' مثلاً اس صورت میں کہ آبادی کے وجود کو خطرہ ہو اس کی مثال "میٹرو مل 1" کی ہے یہ کراچی شہر کی پہلی آبادی ہے کہ جسے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت بسایا گیا تھا اور اس میں UNDP نے تعاون کیا تھا اور جیسا کہ اکثر ہوتا ہے "انسانی آبادکاری کا یہ تجربہ" اس علاقہ میں کیا گیا کہ جہاں کے غریب لوگ تجربہ کے مرحلہ سے دور جا چکے تھے اور اپنی رہائش کا جزوی طور پر حل نکال چکے تھے۔

لہٰذا سرکاری عہدے داروں نے اس بات پر زور دیا کہ ان غیر قانونی تجاوزات کو فوری طور پر ہٹایا جائے' کیونکہ اس کے بغیر حکومت کم آمدنی والوں کے لئے کیسے رہائش پیدا کرے گی؟ کے۔ ڈی۔ اے نے تجاوزات ہٹانے کے لئے ایک ٹیم بھیجی' انہوں نے فوری طور پر مکانوں کی چند قطاروں کو ڈھایا' اور باقی کام دوسرے دن کے لئے چھوڑ دیا۔ رات کو آبادی کے لوگوں کی ایک میٹنگ ہوئی اور یہ سوچا گیا کہ اس سلسلہ کو کیسے روکا جائے؟ چنانچہ حل یہ نکالا گیا کہ اسی رات کو انہوں نے ان مکانوں کے ساتھ ساتھ قبریں بنا دیں کہ جنہیں دوسرے دن گرایا جانے والا تھا۔ جب حسب معمول کے۔ ڈی۔ اے والے آئے تو انہوں نے اپنے راستے میں قبرستان پایا اور چونکہ قبر کو برابر کرنا مذہبی اور ثقافتی طور پر بے ادبی ہے' لہٰذا وہ واپس چلے گئے۔

اگرچہ کے۔ ڈی۔ اے والوں کو معلوم تھا کہ یہ قبریں جعلی ہیں (جب مقامی آبادی والوں کو انٹرویو کیا تو انہوں نے کہا کہ انہیں کتے' بلی' جو بھی ملا اس کی قبر بنا ڈالی) مگر انہیں یہ بھی احساس تھا کہ آبادی والوں نے اپنا کیس مضبوط کر لیا ہے' اور ان کے لئے مکانات کو مسمار کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ بعد میں اس مسئلہ پر کراچی انتظامیہ نے طویل بحث کی اور آخر میں یہ فیصلہ کیا کہ چونکہ قبرستان کو چھیڑنا خطرناک ہے اور اس سے امن و امان کا مسئلہ پیدا ہو گا لہٰذا میٹرو مل 1 کے منصوبہ کو اس طرح سے نافذ کرنا چاہئے کہ قبرستان اور اس کے قریب کے مکانات کو نہ گرایا جائے اور انہیں اس طرح سے رہنے دیا جائے۔

اس کیس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لوگوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ متحدہ ہو کر موثر طور پر عمل کر سکتے ہیں' اور حکام بالا کو اس بات پر مجبور کرنا کہ وہ پھر یو این او کے تشہیر شدہ منصوبہ کو تبدیل کریں' کوئی معمول کارنامہ نہیں۔ اس قسم کے اور بھی واقعات بیان کئے جا سکتے ہیں۔ ان کا خاص پہلو یہ ہوتا ہے کہ یہ دفاعی ہوتے ہیں اور ان میں

حکومت کے منصوبوں پر عمل نہیں ہونے دیا جاتا' مگر یہ مطالبہ نہیں کیا جاتا کہ ان کو بنیادی سہولتیں فراہم کی جائیں۔ اس قسم کے معاملات میں لیڈروں اور لوگوں کے مفادات ایک ہو جاتے ہیں۔

اس مقالہ میں اس بات کی نشان دہی کی گئی ہے کہ کراچی میں کم آمدنی والوں کے مکانات کے سلسلہ میں جو منصوبہ بندی کی گئی اور وہ جس انتشار کا شکار ہوئی' وہ کسی سازش کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی حادثاتی چیز ہے' بلکہ یہ انتشار اس لئے ہے کہ اس میں ان تمام لوگوں کا مفاد ہے جو اس کے ذریعہ اپنے اثر و رسوخ کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ عام لوگوں میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنی رہائش کے مسئلوں کو خود حل کر لیں' بلکہ ان میں یہ صلاحیت بھی ہے کہ متحد ہو کر کام کریں' انہیں اس کا بھی بخوبی احساس ہے کہ ان کا کس طرح سے استحصال کیا جاتا ہے' اور دھوکہ دہی کی جاتی ہے۔ لیکن ان کا لیڈروں کے پنجہ سے نکلنا اس لئے آسان نہیں کہ ان کو تحفظ دینے والا اور کوئی نہیں۔

سرپرستی کے اس نظام کا لوگوں کے اتحاد پر بھی اثر ہوتا ہے' کیونکہ سرپرست اس اصول پر عمل کرتا ہے کہ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" وہ لوگوں کا اتحاد نہیں ہونے دیتا کیونکہ اس سے اس کے وجود کو خطرہ ہوتا ہے۔ اگر سرپرستی کے نظام ختم ہو جائے تو لوگوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ مل کر سماجی تحریک چلا سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سرپرستی کا نظام دو باتوں سے پیدا ہوتا ہے: لوگوں کی بنیادی سہولتوں کا فقدان (خاص طور سے رہائش کے لئے زمین) اور وہ وسیع خلیج جو حکومت کے شعبوں' عہدے داروں اور لوگوں کے درمیان ہے۔

لہٰذا سرپرستی کے نظام کو ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بڑے پیمانہ پر آبادیوں کو قانونی درجہ دیا جائے اور انہیں بنیادی سہولتیں فراہم کی جائیں' یہ رجحان اب کراچی اور دوسرے بڑے شہروں میں بڑھ رہا ہے۔ مقامی آبادی کے لئے یہ بہتر ہے کہ حکومت کی ایجنسیاں مقامی لیڈروں کی جگہ ان کی فلاح و بہبود کے لئے کام کریں۔ جہاں حکومت اور مقامی آبادی میں کوئی رابطہ نہ ہو وہاں نجی سماجی جماعتیں بڑھ کر کام کریں' لوگوں میں شعور کی کمی نہیں' بلکہ لوگوں میں معلومات کی کمی اور ان کی پبلک ذرائع تک پہنچنے کی مشکلات خاص وجوہات ہیں کہ جو ان کو مقامی لیڈروں کا محتاج بناتی ہیں۔ کیونکہ سیاستداں ان ذرائع پر قبضہ کر کے انہیں اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اگر مقامی آبادی کو منا

معلومات فراہم کی جائیں تو وہ سرپرست کی اجارہ داری کو ختم کر سکتے ہیں' کیونکہ جب لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ سہولتیں کیسے حاصل کی جائیں تو پھر انہیں کسی اور کی ضرورت نہیں رہے گی اور وہ اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کر سکیں گے۔ اس سلسلہ میں نجی جماعتیں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں' اور غریبوں کو مقامی لیڈروں اور ان کے سرپرستوں سے چھٹکارا دلا سکتی ہیں۔

اگرچہ موجودہ نظام سماجی تحریک کو روکے ہوئے ہے۔ مگر یہ زیادہ عرصہ نہیں روک سکے گا' کیونکہ حالات جس طرح سے بدل رہے ہیں' ان میں بڑھتی آبادی' شہروں کا پھیلنا' اور ٹیکنالوجی کا استعمال یہ سب عناصر مل کر سماجی تبدیلی لائیں گے اور اس نظام کے خلاف جدوجہد ہو گی جس میں درمیانی رابطوں کی جماعتوں کا کردار بڑا اہم ہو گا۔

کچی آبادیاں' منصوبہ بندی' اور انتظامیہ

(یان فان ڈیرلنڈین)

۱۹۷۵ء۔ ۷۶ کی بات ہے کہ کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن نے شہر کے پس ماندہ رہائشی علاقوں کی بہتری کا ایک منصوبہ بنایا۔ اس میں انہوں نے خصوصیت سے کم آمدنی والے لوگوں کو رہائش فراہم کرنے کی منصوبہ بندی کی جو کہ کراچی میں ایک نئی بات تھی اس ضرورت کو اس طرح سے سمجھا جا سکتا تھا کہ کراچی میں کم آمدنی والے لوگوں کے مسلسل اضافے کی وجہ سے یہ ناممکن ہو گیا تھا کہ انہیں روایتی طریقوں سے آباد کیا جا سکے۔ دوسرے یہ کہ اب تک جو بھی طریقے ان لوگوں کو آباد کرانے کے لئے آزمائے گئے وہ یا تو بالکل ناکام ہو گئے تھے یا جزوی طور پر کامیاب ہو سکے تھے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ نئے طریقوں کو سوچ سمجھ کر اور تحقیق کے بعد اختیار کیا جائے۔

لہٰذا نئی پالیسی جو تشکیل دی گئی اس میں غیر قانونی کچی آبادیوں کے بہت سے حقوق کو تسلیم کر کے اس بات کی کوشش کی گئی کہ ان کو بہتر بنایا جائے۔ اس نئی پالیسی کے اہم نکات یہ تھے۔

(الف) موجودہ بستیوں کو سدھارنے پر زور دیا گیا۔ سدھارنے سے مراد تھی:

۱۔ ان کو قانونی درجہ دیا جائے۔

۲۔ فطری و سماجی ڈھانچہ کو جس میں ماحول' صفائی' سڑکیں' اسکول اور کھیل کے میدان آتے ہیں' ان پر توجہ دی جائے۔

(ب) اس بات کو دیکھا جائے کہ بہتری کا منصوبہ مالی طور پر مستحکم ہو' تاکہ اس پر عمل ہو سکے۔ اس مالی منصوبہ میں خصوصیت سے رہائش پذیر آبادی سے پیسے لئے جائیں۔

(ت) مندرجہ بالا نکات کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں رہائش پذیر لوگوں کا کردار انتہائی اہم تھا۔ معیار کا پیمانہ لچک دار تھا اور اس بات کی گنجائش تھی کہ مثالی اور عملی صورت حال میں توازن ہو اور کوشش کی جائے کہ لوگوں کی شرکت زیادہ سے زیادہ ہو۔

اس پالیسی پر عمل درآمد کرنے کے لئے بہت سے مالی' فنی اور قانونی مسائل تھے لیکن سب سے بڑی رکاوٹ رابطہ کی کمی تھی' اور پھر مختلف عوامل کے درمیان مفادات کا تصادم

تھا، جن میں بستی کے رہنے والے، اور حکومت و سیاستداں شامل تھے۔

دیکھا جائے تو عام نقطہ نظر سے تمام کچی بستیاں غیر قانونی ہیں۔ اور چونکہ یہ غیر قانونی ہیں اس لئے یہ ضرورت بڑھ جاتی ہے کہ ان کو منظم کیا جائے اور حکومت کی ہر اس کوشش کو روکا جائے کہ جس کے ذریعہ وہ انہیں مسمار کرنا چاہتی ہے۔ بستی کی تنظیم میں اس وقت کمی آ جاتی ہے کہ جب حکومت اسے کسی نہ کسی شکل میں منظور کر لیتی ہے، میں اس نکتہ پر بعد میں روشنی ڈالوں گا۔

اگر کچی بستیوں کے بارے میں تحقیق کی جائے تو یہ دو قسم کی ہوتی ہیں، اور اس لحاظ سے ان کی اپنی تنظیم ہوتی ہے۔ ہمارے موضوع کا تعلق اس سے ہے۔

پہلی قسم کی کچی بستی: ہموار ترقی

سب سے پہلے تو اس قسم کی بستیاں ہوتی ہیں کہ جو اچانک وجود میں آ جاتی ہیں اس صورت میں تھوڑے بہت لوگ کسی ایک جگہ پر جھگیاں ڈال لیتے ہیں (اکثر یہ زمین دریا کے کنارے یا ریلوے پٹری کے ساتھ ہوتی ہے، مگر کبھی کبھی (شہر) کی آخر حد تک وسیع جگہ بھی ہوتی ہے) اس بستی کے لوگ شروع ہی سے دفاعی حربے اختیار کرتے ہیں، اور حکومت کی ہر اس کوشش کو جس کے ذریعہ انہیں بے دخل کیا جائے اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اس لئے یہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بلا کر اس جگہ آباد کرتے ہیں تاکہ زیادہ تعداد کی وجہ سے ان کا تحفظ ہو سکے۔

ایک مرتبہ جب وہ اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ وہ جہاں بھی رہیں اس کی اجازت ہے تو پھر ان کی دوسری کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ بنیادی سہولتوں کے لئے مطالبہ کریں (جس میں پہلا مطالبہ پانی کا ہوتا ہے) اس صورت حال میں ایک مضبوط تنظیم اور زیادہ سے زیادہ بستی کے لوگوں کی شرکت ضروری ہوتی ہے۔ ایک فرد تنظیم میں اپنی شمولیت اس وقت کر لیتا ہے کہ جب وہ غیر قانونی طور پر جھگی ڈال کر خطرہ مول لیتا ہے۔ اس قسم کے واقعات سب کو معلوم ہیں کہ مشکلات کے وقت بستی کے رہنے والے روز اپنی میٹنگ کرتے ہیں اور پیدا شدہ مسائل پر بحث کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ جب بے دخلی کا خطرہ ٹل جاتا ہے اور بستی میں بنیادی سہولتیں مل جاتی ہیں تو اس کے ساتھ ہی تنظیم میں بھی کمی آ جاتی ہے قانونی درجہ حاصل کرنا بنیادی سہولتیں حاصل کرنا یہ سب مطالبے غائب ہو جاتے ہیں۔ کچھ واقعات میں یہ تنظیم اس وقت دوبارہ

ابھرتی ہے کہ جب حکومت ان بستیوں کو قانونی درجہ دینا چاہتی ہے، تاکہ اس کے ذریعہ سے بات چیت و معاہدہ کیا جا سکے اور زمین کی قیمت، فیس، اور سہولتوں کے بارے میں فیصلہ کیا جا سکے۔

دوسری قسم کی بستی: ابتدائی اور جزوی ترقی

یہ دوسری قسم کی بستی شہر کی حدوں پر آباد ہوتی ہے جہاں دلال اور ایجنٹ حکومت سے اس کی منظوری لیتے ہیں۔ یہ اس قسم کی منظوری ہوتی ہے کہ اگر خاص شرائط کے ساتھ وہ زمین کو رہائش کے لئے تقسیم کر دیں تو انھیں پریشان نہیں کیا جائے گا۔ ان شرائط میں افسروں اور دوسری پارٹیوں کو رشوت دینا وغیرہ شامل ہوتا ہے۔

اس صورت حال میں "درمیانی آدمی" جسے غیر سرکاری طور پر حکومت کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے، وہ بستی کے لوگوں کی تنظیم بناتا ہے اور ان کو متحد کرتا ہے۔ "درمیانی آدمی" ہی بستی کی بنیاد رکھتا ہے، افراد کو پلاٹ دیتا ہے، پانی اور ٹرانسپورٹ کی سہولتیں فراہم کرتا ہے۔ بستی کے لوگوں کے لئے اس درمیانی آدمی ہی کی سرپرستی ضمانت ہوتی ہے، کیونکہ ان کے پاس نہ تو پلاٹ کے کاغذات ہوتے ہیں اور نہ قبضہ کی کوئی قانونی دستاویز۔

اس کے نتیجہ میں بستی کے رہائش پزیر لوگوں کی تنظیم میں شمولیت کافی کمزور ہوتی ہے یا نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے درمیانی آدمی، یا اس کے ارد گرد بااثر افراد کا ٹولہ، بستی کے لیڈر بن جاتے ہیں، یہ وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جن کی پہنچ حکومت کے اداروں تک ہوتی ہے۔ اگر بستی میں سیاسی جماعتیں بھی بنتی ہیں تو ان کا وجود "درمیانی آدمی" اور اس کے حواریوں کا مرہون منت ہوتا ہے۔

بستی کے رہنے والوں کے مقاصد:

چاہے بستیوں کی اقسام کئی ہوں اور چاہے ان کے رہنے والے کئی طرح کے ہوں، لیکن ان کے مقاصد ایک ہی ہوتے ہیں۔ جو کہ یہ ہوتے ہیں:

۱۔ حق ملکیت حاصل کرنا۔
۲۔ کچھ بنیادی سہولتیں حاصل کرنا۔
۳۔ حق ملکیت اور سہولتوں کے لئے کم از کم ادائیگی۔

یہ تینوں ضروریات ایک دوسرے سے منسلک ہوتی ہیں اور بستی کی زندگی میں ہر مرحلہ

پر ایک توازن کو پیدا کرتی ہیں۔ جب بستی میں بنیادی سہولتیں بالکل نہ ہوں' یا بہت کم ہوں' تو بستی کے رہنے والے ان کے حصول کے لئے زیادہ سے زیادہ پیسے دینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب بستی میں یہ سہولتیں آجاتی ہیں' تو اس کو حکومت کی جانب سے یہ اشارہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ بستی کو قانونی درجہ دینے پر تیار ہے اس سے تحفظ کا احساس بڑھ جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ادائیگی کی خواہش بھی کم ہو جاتی ہے۔

اس ضمن میں ان بستیوں میں کہ جہاں ترقی ہموار ہوتی ہے' اور جہاں کی ترقی جزوی ہوتی ہے' فرق اہم ہو جاتا ہے' عام طور سے ان بستیوں میں کہ جہاں ترقی ہموار ہوتی ہے وہاں پر لوگوں کو دوسری بستیوں کے مقابلہ میں لیز حاصل کرنے کی خواہش بڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا ہموار ترقی والی بستیوں میں ادائیگی کا رجحان بھی زیادہ ہوتا ہے دوسرے ان بستیوں میں زمین کی سٹہ بازی زیادہ نہیں ہوتی اور یہاں پر رہائش پزیر لوگوں کی تنظیم جزوی ترقی والی بستی کے مقابلہ میں زیادہ منظم ہوتی ہے۔ یہ تمام حالات اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ ان بستیوں کو قانونی درجہ حاصل کرنے اور سہولتیں حاصل کرنے میں زیادہ کامیابی ہوتی ہے۔

مگر حکومت کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ جزوی طور پر ترقی کرنے والی بستیوں پر زیادہ توجہ دی جائے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کی نشان دہی اس مقالہ میں دوسری جگہ کی جائے گی۔

بستیوں کی ترقی کے عمل میں حکومت کی شرکت آہستہ آہستہ بڑھتی ہے جس کا اندازہ ان کو دی جانے والی سہولتوں سے ہوتا ہے۔ ان کو قانونی درجہ دینا بستی کی زندگی میں حکومت کا آخری قدم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد بستی کچی آبادی نہیں رہتی بلکہ قانونی اور باقاعدہ رہائشی آبادی ہو جاتی ہے کہ جس میں حکومت کی شرکت سرکاری طور پر سو فیصد ہوتی ہے اس وقت جب کہ بستی کو قانونی درجہ دینے کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو اس وقت بستی کے لوگ اس مرحلہ پر ہوتے ہیں کہ جہاں انہیں یقین ہوتا ہے کہ انھیں کسی صورت میں بے دخل نہیں کیا جا سکتا ہے اس مرحلہ پر وہ کافی حد تک سہولتیں حاصل کر چکے ہوتے ہیں۔ اس لئے نتیجتاً یہاں پہنچ کر قانونی طور پر ادائیگی کی خواہش بہت کم ہو جاتی ہے۔

ان معاملات میں قانونی حیثیت کا مطلب ہوتا ہے کہ موجودہ صورت حال کو تسلیم کر لیا جائے اگرچہ یہ ایک ایسی منظوری ہوتی ہے کہ جس کے کوئی معنی نہیں ہوتے لیکن وہ بستی والوں کے لئے بڑی قیمتی ہوتی ہے ان حالات میں بستی کے رہنے والے صرف اس وقت ادائیگی پر تیار ہوتے ہیں کہ جب یا تو قانونی حیثیت کے ساتھ ساتھ انفرااسٹریچر (بالائی

ڈھانچہ) میں بہتری کے اقدامات کئے جائیں' یا لیز کی فیس معمولی ہو اور اس کی ادائیگی کا طریق کار سادہ ہو اگر آخری طریقہ کار اختیار کیا جائے تو قانونی حیثیت کے بعد بستی کے لوگ قانونی طور پر لوکل گورنمنٹ پر دباؤ ڈال سکتے ہیں کہ وہ انھیں بغیر کسی ایک پیسہ کی ادائیگی کے تمام سہولتیں مہیا کرے' کیونکہ قانون کے تحت یہ مونسپلٹی کی ذمہ داری ہے کہ وہ بالائی ڈھانچہ کو برقرار رکھے۔

ایک اور موثر عنصر جو بستی کے رہنے والوں کی ضرورت یا اس ضرورت سے انکار پر انھیں متحرک کر سکتا ہے وہ بستی کو قانونی درجہ دینے کا ہے۔ جب تک بستی غیر قانونی ہوتی ہے اس وقت تک وہاں پر زمین کی قیمتیں کم ہوتی ہیں۔ کیونکہ غیر قانونی زمین کی تجارت کم آمدنی والے لوگوں میں ہوتی ہے۔ لیکن جب اس کی قانونی حیثیت ہو جاتی ہے' چاہے وہ کسی شکل میں ہو' تو درمیانی اور زیادہ آمدنی والے لوگ مارکیٹ میں مقابلہ پر آجاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں قیمتیں بڑھنا شروع ہو جاتی ہیں اور قیمتوں کا یہ چڑھاؤ خاصہ ہوتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ یہ بستی کے رہنے والوں کے مفاد میں ہوتا ہے کہ ان پلاٹوں کی قیمتیں بڑھیں' لیکن اکثر حالات میں وہ فوری طور پر اپنے منافع کو نقدی کی صورت میں وصول کرنا نہیں چاہتا۔ وہ اگرچہ اس پر فخر اور خوشی محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک پلاٹ کا مالک ہے لیکن اس کو بھی معلوم ہے کہ دوسرے پلاٹ کی خریداری میں اسے اتنے ہی پیسے دینا ہوں گے۔ اس کا فوری منافع اس میں ہوتا ہے کہ سماجی اور معاشی طور پر قانونی مالک بن کر ارتکاز زر سے آزاد جائداد اس کے پاس ہو جائے۔ چونکہ یہ منافع فوری طور پر ظاہر نہیں ہوتا' اس لئے بستی کے رہنے والے کو اس میں دلچسپی ہوتی ہے کہ پلاٹ کہیں مہنگا نہ ہو جائے (اور وہ اسے حاصل نہ کر سکے) ایک مرتبہ جب اسے بے دخلی کا ڈر نہیں رہتا تو پھر اس کی ترجیحات میں سہولتوں کا مطالبہ ہوتا ہے۔ ایک غریب بستی کا رہنے والا جب مالی مشکلات کا شکار ہوتا ہے تو وہ پلاٹ بیچ کر اس کی قیمت وصول کرنے پر تیار ہو جاتا ہے' یہ قیمت اسے مالدار لوگ دینے پر تیار ہوتے ہیں اس طرح آگے چل کر قانونی اور بہتر سہولتوں والی بستی آہستہ آہستہ' متوسط درجہ کے لوگوں کے پاس چلی جاتی ہے۔

وہ "درمیانی آدمی" جو کہ دوسری قسم کی بستی بساتا ہے وہ پھر وہاں تنظیم بناتا ہے' اس کا کیس ذرا مختلف ہوتا ہے۔ ابتدائی طور پر یہ دلال سستے داموں پر پلاٹ بیچ دیتے ہیں لیکن اس کا خیال رکھتے ہیں کہ وہ کئی پلاٹ اور خاص طور سے کمرشل پلاٹ جو کہ سڑک کے سامنے ہوتے ہیں انھیں باقی رکھیں کیونکہ ایک بار جب یہ بستی آباد ہو جاتی ہے تو یہ پلاٹ

بہت مہنگے ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ محض ایک سٹہ بازی ہوتی ہے۔ لیکن اس سٹہ بازی میں دلال کو یہ دلچسپی ہوتی ہے کہ بستی کو قانونی درجہ ملے' کیونکہ اس کے ساتھ ہی سٹہ بازی کا منافع بڑھ جاتا ہے۔ ان دلائل کی ہم بعد میں وضاحت کریں گے کہ کیوں قانونی درجہ کے ساتھ سہولتوں کے حصول میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے ہیں۔

بستی کے رہنے والوں کے ادارے

ایک عام بستی کا رہنے والا جس کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ غریب آدمی ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بستی کے رہنے والوں کا تین چوتھائی حصہ ان پر مشتمل ہوتا ہے جو غیر ہنر مند مزدور' ریڑھی والے (بولی لگا کر بیچنے والے یا بستی کے چھوٹے دوکاندار) یا ملازم ہوتے ہیں۔ اس لئے واضح طور پر یہ کم آمدنی والے لوگ ہوتے ہیں اور ان میں بہت کم اس بات کی اہلیت ہوتی ہے کہ اپنے مسائل پر بات چیت کر سکیں' اس لئے ان کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ اپنی حیثیت کے مطابق حکومت سے تحفظات اور سہولتیں حاصل کر سکیں۔ اس سے پہلے ہم نے دو بستیوں کے فرق کو واضح کیا ہے' لیکن چاہے بستی کے فرق کچھ بھی ہو' اس کے لیڈر' راہنما اور ترجمان وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جن کی پہنچ حکومتی اداروں تک ہوتی ہے۔ اس لئے ان کی یہ تعریف کی جا سکتی ہے کہ وہ زیادہ تعلیم یافتہ' پیسے والے' اور عام بستی والوں کے مقابلہ میں زیادہ طاقت ور ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ عام بستی والوں کے صحیح طور پر نمائندہ نہیں ہوتے ہیں' اور ان میں سے اکثر کا تعلق اونچے طبقوں سے ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ بستی والوں کے صحیح نمائندے تو نہیں ہوتے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے پیروکاروں کے مفادات کی صحیح نمائندگی نہیں کرتے' کیونکہ نظریاتی اور حقیقت میں یہ مفادات ایک بھی ہو جاتے ہیں۔ کراچی کی بستیوں میں تمام پھیلے ہوئے نظام میں سرپرست و گاہک کا رشتہ ہے۔

سرپرستی کی شکل ایک ادارہ جیسی ہو گئی ہے' اگرچہ یہ غیر رسمی ہوتی ہے' اور اس میں دو اشخاص کے درمیان کاروبار ہوتا ہے۔ یہ دو اشخاص اپنے مفادات اور دلچسپیوں کے اعتبار سے جدا ہوتے ہیں' اس کاروبار میں سرپرست اپنے اثر کو دوسری پارٹی کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اس کے بدلہ میں موکل اپنے سرپرست کے مفاد کے لئے ہر قسم کی خدمات پیش کرتا ہے۔ اس لئے ایک بستی کے لیڈر کی یہ تعریف کی جا سکتی ہے کہ ایک ایسا شخص جو اپنے اثر اور طاقت کو استعمال کرتا ہے اور جس کی حکمراں طبقوں میں پہنچ ہوتی ہے کہ جہاں فیصلے

کئے جاتے ہیں۔ ایک راہنما کی خوبی ہوتی ہے کہ اس کے ذاتی محرکات اور مفادات کچھ بھی ہوں وہ ان کو ثانوی حیثیت دیتا ہے۔

ان لیڈروں کے مقاصد کیا ہوتے ہیں؟ ان دلال راہنماؤں کا جو دوسری قسم کی بستیوں میں رہتے ہیں' ان کا خاص مقصد سٹہ بازی کا ہوتا ہے' لیکن کسی حد تک یہ پہلی قسم کی بستی کے راہنماؤں کے لئے بھی صحیح ہے جو کہ پیسے والے اور طاقت ور ہوتے ہیں اور جن کے بستی میں کئی پلاٹ ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے لیڈروں اور عام بستی کے رہنے والوں کے مفادات جزوی طور پر ایک ہو جاتے ہیں۔ وہ سستی لیز حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کاروبار میں سرپرست و گاہک کے رشتے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے بستی کے رہنے والے سہولتیں حاصل کرنے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی رہائش کا تحفظ خود بخود ہو جاتا ہے۔ لیڈر اپنی جانب سے قانونی درجہ دینے اور سہولتوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیتے ہیں' کیونکہ ان دو چیزوں کو علیحدہ کرنے کے بعد لیز کے ریٹ کم ہو جاتے ہیں اور پھر لیڈر دباؤ کے ذریعہ ضروری سہولتوں کے حصول پر توجہ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ایک سستا طریقہ ہے' لیکن اس طرح سے وہ اپنی طاقت کو بھی برقرار رکھتے ہیں' کیونکہ اگر بستی کے رہنے والوں کے تمام مقاصد پورے ہو گئے تو پھر ان کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ مثلاً دلال کیونٹی اور قومی مفادات کو علیحدہ علیحدہ کر کے دیکھتا ہے اور ان کے درمیان تضادات کو حل کرتا ہے۔ یہ ان کے مفاد میں نہیں ہوتا کہ وہ مسائل کو حل کریں' کیونکہ اس طرح سے وہ اپنی افادیت کھو بیٹھیں گے۔ اس لئے اکثر وہ بستی اور حکومت کے درمیان رابطہ کا کام کرتے ہیں اور اس کھچاؤ کو باقی رکھتے ہیں کہ جو ان کے عمل کو فعال بناتا ہے۔

بستی کے لیڈروں کا ایک پہلو اور بھی ہے' جو ترقی میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے' کیونکہ لیڈروں میں باہمی طور پر سخت مقابلہ ہوتا ہے اور ایک ہی بستی میں کئی لیڈر اپنے حمایتوں کے ساتھ کام کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی جہاں تک ممکن ہوتا ہے مخالفت کرتے ہیں' اس سے یہ بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لیڈر کس حد تک لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

حکومت : درجہ بندی' منصوبہ بندی کے ساتھ انتشار' نوکر شاہی کا ایک الجھاؤ والا کیس

بستی کی لیڈرشپ کی طرح لوکل گورنمنٹ بہت زیادہ درجہ بندی کا شکار ہوتی ہے۔

کراچی میں مقامی سطح پر تقریباً ۶۰ حکومتی اور نیم حکومتی ادارے ہیں۔ جو منصوبہ بندی اور عمل درآمد پر کام کرتے ہیں، جن میں پبلک ورکس، مکانات کی تعمیر، اور معاشی ترقی وہ سہولتیں مہیا کرنا شامل ہے۔ ان ایجنسیوں کے درمیان بہت کم رابطہ ہوتا ہے، بلکہ ہر ایجنسی، اس بات کی کوشش کرتی ہے کہ اپنی سلطنت خود تخلیق کرے بجائے اس کے کہ دوسرے شرکت کریں یا جزوی طور پر اپنے اختیارات انہیں دیں۔ اکثر ان ایجنسیوں کی حدود اور ذمہ داریاں غیر متعین ہوتی ہیں اور ان کے درمیان باہمی تصادم عام ہوتا ہے۔ ان ایجنسیوں کے اپنے اندر ان کے مختلف شعبوں میں بہت کم رابطہ ہوتا ہے۔

ایک باہر سے آنے والے کو ایسا نظر آتا ہے کہ جیسے تمام فیصلے اچانک ہوتے ہیں، لیکن یہ جو انتشار پیدا کیا گیا ہے یہ ایک منصوبہ بندی کے تحت ہوا ہے، اور اس حد تک کہ پیش گوئی کے طور پر یہ بتایا جا سکتا ہے کہ فائل کہاں پر جا کر گم ہو جائے گی۔ اس صورت حال کو بیان کرنے کے لئے میں ایک مثال دیتا ہوں، جو کہ ہے تو ذہن کی پیداوار مگر صحیح صورت حال کی نمائندگی کرتی ہے۔

فرض کریں کہ کس ڈیپارٹمنٹ میں ۱۰ عہدے دار ہیں جو کہ ۴ کاریں مشترکہ طور پر استعمال کرتے ہیں، اور اصول یہ ہے کہ جو پہلے آئے گا وہ کار کو اپنے استعمال میں لائے گا۔ اس کا سیدھا سادھا طریقہ تو یہ ہونا چاہئے کہ ایک سادہ چارٹ آفس میں کسی مرکزی جگہ پر لٹکا دیا جائے جس میں مہینوں کے دنوں اور گاڑیوں کو دکھایا گیا ہو تاکہ کوئی بھی افسر گاڑی کو اپنے لئے بک کرا لے۔ اس کے ذریعہ یہ بھی دیکھا جا سکے کون کس وقت کون سی گاڑی کو استعمال کر رہا ہے، اور کوئی سی گاڑی موجود ہے۔

اگر یہ معمول ہو تو ایک کلرک کا کام صرف یہ ہو گا کہ کیا افسر کی ضرور درست ہے؟ یہ دیکھ کر وہ اسے گاڑی کی چابی اور لاگ بکس دیدے، اور جب افسر واپس آئے تو اس سے دونوں چیزیں واپس لے لے۔ لیکن ٹرانسپورٹ کلرک کے لئے اس طرح کے کام میں کوئی دلچسپی نہیں ہو گی، لہذا اس کا طریقہ کار یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے پاس سائیکلو اسٹائل فارم رکھتا ہے، کہ جن پر گاڑی حاصل کرنے کے لئے مطالبہ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس فارم میں غیر ضروری قسم کی باتیں پوچھی جاتی ہیں۔ یہ فارم بھر لے اور خراب طریقہ سے سائیکلو اسٹائل کئے جاتے ہیں، اور ان کا ڈھیر کلرک کی میز پر ہوتا ہے کہ جو بار بار بجلی کے پنکھے سے بکھرتے رہتے ہیں۔

لہذا ہموار طریقہ سے چلنے کے بجائے پورا سسٹم گڑبڑ ہو کر رہ گیا، اس شخص کے لئے بھی جو اس کا انچارج ہے اس میں کوئی دلچسپی نہیں رہی، یہ سسٹم اپنی خرابیوں کے باوجود اگرچہ کام کرے گا، مگر اس میں تمام معلومات پر کلرک کی اجارہ داری ہو گی اور وہ قانون کے تحت گاڑی کی چابیاں دینے کے بجائے اپنے اختیارات کو استعمال کرے گا کہ کس کو دے اور کس کو انکار کرے، یہ صورت حال اسے اہم اور صاحب عزت بنانے میں مدد دے گی اور جب اسے ضرورت ہو گی تو وہ افسروں سے اس کے بدلے میں رعائتیں طلب کرے گا، اور وہ بھی انکار کرنے سے پہلے دو بار یقیناً سوچیں گے۔

ویسے بھی اکثر افسر اس سسٹم سے قطعی نالاں نہیں، کیونکہ اس کے ذریعہ ان کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ گاڑیوں کو نجی طور پر خوب استعمال کریں، اس کے بدلہ میں کلرک کی آمدنی، اختیارات اور عزت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

جس کلرک کی ہم نے مثال دی وہ گاڑی اور اپنی خدمت کی وجہ سے اثر و رسوخ حاصل کر لیتا ہے اور افسروں سے تعلقات قائم کر لیتا ہے جو کہ سرپرست و گاہک کے تعلقات سے مشابہت رکھتے ہیں ایسے میں پبلک کے ذرائع کو پبلک کے استعمال کی توقع کم ہی رکھنی چاہئے۔

اس کے بعد ضروری ہے کہ کچھ نکات کی تشریح کی جائے تاکہ یہ بتایا جا سکے کہ کس طرح سے منصوبہ بندی کے تحت انتشار کو ایک منظم ادارے کی شکل دی گئی ہے۔

۱۔ نوآبادیاتی نظام نے نئی ریاستوں کو ایک خاص قسم کا پبلک سروس کا نظام ورثہ میں دیا، جس کی روح آمرانہ اور مقصد منفی ہے۔

۲۔ پاکستان میں حکومت کا جو نظام قائم ہے وہ اس اصول پر ہے کہ انتظامی معاملات میں، منصوبہ بندی اور اس عمل درآمد کی پالیسی دونوں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ پاکستان نے جو ایک مضبوط روایت ورثہ میں پائی ہے اس کے تحت یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ صرف سرکاری ملازمین کے ذریعہ ہی انتظامی امور بہتر طریقہ سے سرانجام دیئے جا سکتے ہیں۔ ان افسروں کا انداز پیشہ ورانہ اور سرپرستانہ ہوتا ہے۔ اس کا سیدھا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فنی ماہرین انتظامی طور پر عمومی انداز کے افسروں کے ماتحت ہوتے ہیں (کہ جو فنی معلومات سے بے بہرہ ہوتے ہیں)

۳۔ اس قسم کا سسٹم بن گیا ہے کہ جس میں اہم انتظامی عہدوں پر افسروں کے تبادلے برابر ہوتے رہتے ہیں، اس وجہ سے افسروں اور ان کے محکموں کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔

بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان میں انتشار ایک منصوبہ بندی کے تحت پیدا گیا گیا ہے یہ یقینی طور پر اس روایت کے نتیجہ میں پیدا ہوا کہ جسے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی کیا جاتا ہے۔ اس پر عمل در آمد اس وقت سہل ہو جاتا ہے کہ جب اس نظام کو عموی نقطہ نظر سے افسر چلاتے ہیں' حکومت کے ملازمین اور عوامی لیڈروں میں سرپرست و موکل (گاہک) کے جیسے تعلقات ہوتے ہیں' اور اس نظام میں کثرت سے تبادلے عہدے داروں کو مختلف شعبوں میں مہارت حاصل کرنے کا موقع نہیں دیتے۔ پبلک کے ذرائع خصوصی کنٹرول کی وجہ سے عہدے دار جس کو چاہتے ہیں فائدہ پہنچاتے ہیں۔ یہ فائدے اس لئے بھی ہوتے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ وہ اپنی طاقت اور مقبولیت کو بڑھائیں۔ اس نظام میں ایک جانشین اپنے سابقہ افسر کے کارناموں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے' جس کی وجہ سے کسی بھی پالیسی میں تسلسل برقرار نہیں رہتا ہے۔

۴۔ اکثر سیاسی تبدیلیاں اور طویل سیاسی بے یقینی انتظامیہ کی قوت کو اور بڑھا دیتی ہے' لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اہم فیصلے کرتے ہوئے محتاط ہو جاتے ہیں۔

۵۔ ایسے ادارے جو سپلائی کا کام کرتے ہیں وہ کمزور ہیں۔

۶۔ اکثر افسروں کی تنخواہیں کم ہوتی ہیں۔

ان نکات کے پیش نظر (میں یہ دعوئی نہیں کرتا کہ یہ مکمل صحیح ہیں' میں نے صرف اہم رجحانات کی طرف اشارہ کیا ہے) کچی آبادیوں میں پالیسی پر عمل در آمد کے یہ نتائج نکلتے ہیں۔

۱۔ بستی کے رہنے والوں کے خاص حقوق کو تسلیم کرنا (رہائش کا حق' بستی کی ترقی میں شرکت کا حق)

۲۔ منصوبہ پر عمل کرنے کے لئے باقاعدہ طریقہ کار بنانا اور اسے ایک منظم شکل دینا (جیسے رہائش پذیر لوگوں کی شمولیت' فنڈ جمع کرنا' لیز کا سادہ طریقہ' فطری ماحول کو بہتر بنانا)

یہ دونوں باتیں ان لوگوں کے لئے باعث دلچپی نہیں کہ جو انتشار سے محبت کرتے ہیں' چاہے ان کی حیثیت انفرادی ہو یا ایجنسی کی۔ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ بستی کے لوگوں کے حقوق کو واضح نہیں کیا جائے اور نہ ان کی تعریف کی جائے' اور ان کے مسائل کے حل کے لئے ایسی پالیسی بنائی جائے کہ جو ان کی مرضی کے مطابق ہو۔ اس طرح سے تمام اختیارات فرد یا ایجنسی کے پاس جمع ہو جاتے ہیں۔

۲۔ جب چاروں طرف انتشار کی حالت ہو تو اس سے باصلاحیت افسروں کی کوششیں بھی

متاثر ہوتی ہیں' اور وہ اپنی کوششوں کو ترک کر دیتے ہی۔ ان کے ساتھ مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حکومتی اور محکماتی اختیارات کے ڈھانچہ میں رہتے ہوئے کچھ کر نہیں سکتے' اور اگر وہ واقعی میں کچھ کرنا چاہیں تو انہیں غیر سرکاری طریق کار کو اختیار کرنا ہوتا ہے مگر اس طرح سے وہ طویل منصوبہ بندی کو پورا نہیں کر سکتے' اس وجہ سے پرانا نظام قائم رہتا ہے۔

انتظامیہ کے اس طریق کار کو جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے' اگر اس کا مقابلہ گیرٹز کے "زراعتی الجھاؤ" کے ساتھ کیا جائے تو اس سے اس نظام کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی۔ میک گی نے الجھاؤ کی اصطلاح گیرٹز سے لی ہے اور اس نے اسے شہر سے تعلق رکھنے والی "بازار معیشت" کے لئے استعمال کیا ہے۔ اس نے یہ بھی اشارہ کیا ہے کہ انتظامیہ کے مختلف طریقہ کار لیبر کے اصولوں سے گہری مماثلت رکھتے ہیں' اور یہ اصول بازار معیشت کی عکاسی کرتے ہیں۔ الجھاؤ کے اس طریق کار کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ ایک مسلسل عمل ہے جو کہ ایک ایسے نظام کو مسلسل بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے جو کہ تبدیلی کے عمل میں خود کو حالات کے تحت نہیں ڈھال سکا۔ الجھاؤ کا ایک بنیادی نقطہ یہ ہے کہ بغیر تبدیلی کے گہرائی میں جایا جائے' یا گیرٹز کے الفاظ میں "پرانے پلاٹ پر زیادہ محنت کی جائے اور نئے قائم نہ کئے جائیں" یعنی اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے "بغیر تبدیلی کی تبدیلی" ایک ایسا رجحان کہ جو روایتی طریقوں کو تبدیل نہ کرے بلکہ انہیں لچک دار بنا دے یعنی "جمود کی حالت میں پھیلاؤ"

الجھاؤ کے عمل کے چار طریقوں کو گیرٹز نے اس طرح سے بیان کیا ہے:

۱۔ بنیادوں کا استحکام

۲۔ اندرونی آراستگی و خوبصورتی

۳۔ فنی موشگافیاں

۴۔ نہ ختم ہونے والی پاکیزگی

ان خصوصیات کو کراچی کی انتظامی مشنری پر غیر یقینی حد تک درست قرار دیا جا سکتا ہے' لہٰذا اس صورت حال میں انتظامیہ کے الجھاؤ پر بولنا ٹھیک ہی ہے۔ یپ نے اپنے مقالہ "بھوٹہ گاؤں کا کیس" میں تفصیل سے بیان کیا ہے کہ کس طرح سے انتظامیہ منصوبہ پر عمل کرنے میں ناکام رہی' اور نتیجہ یہ نکلا کہ بس حکومت کے ملازم روزمرہ کی طرح کام کرتے رہے۔ اس کیس میں اس کی گنجائش تھی کہ مقامی انتظامیہ پیسے اور وقت کو بچا سکتی تھی' لیکن سختی کے ساتھ پرانی روایات قائم رکھ کر' اور اس طریق کار کو اختیار کر کے کہ

جس میں بدعنوانی کو روکنے کے کئی طریقے ہیں' (مگر بدعنوانی ختم نہیں ہوتی ہے) اس نظام میں اختیارات کے صحیح و غلط استعمال کی بھی نئی نئی تاویلات ہیں۔ (مثلاً کسی فائل کو اس لئے واپس نیچے کی طرف بھیج دینا کہ اس کا ایک صفحہ غلط جگہ پر لگا ہوا ہے) اس میں اہم موضوعات پر بحث سے کترایا جاتا ہے' اور کام کے نتیجے تو کچھ نہیں نکلتے سوائے اس کے کہ افسران اعلیٰ مصروف رہتے ہیں۔

لیز کرانے کا طریقہ جو کراچی میں' وہ کئی لحاظ سے ناقابل عمل ہے' مثلاً ہر لیز کے سلسلہ میں جو دستاویزات جاری ہوں گی' اس کا ریزولیشن کارپوریشن پاس کرے گی اور اس پر ایڈمنسٹریٹر کے دستخط ہوں گے "اندرونی آراستگی" کی مثال اس طرح دی جا سکتی ہے کہ لیز کی درخواست دینے والے کو ایک آفس سے فارم لینا ہو گا' لیکن سرکاری اسٹمپ اُسے دوسرے آفس سے ملیں گی' درخواست اس وقت دی جا سکے گی جب کہ اس پر اسٹمپس ہوں "فنی موشگافیوں" کو اس طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے درخواست دہندہ کو کم از کم ۸ بار ایک ہی آفس کے چکر لگانا ہوں گے۔

اس عمل کو "نوکر شاہی کا الجھاؤ" کہتے ہوئے کچھ اہم عناصر کی نشان دہی کی جاتی ہے:

۱۔ الجھاؤ کے عمل کا بنیادی کام یہ ہے کہ اس نظام میں زیادہ سے زیادہ افراد کو کھپایا جا سکے۔

۲۔ نظام جیسا کہ یہ ہے' اس صورت میں اسے برقرار رکھا جائے۔

۳۔ جس طرح زراعتی کسان نظام اور شہر کی بازار معیشت کی پیداوار ایک دوسرے کی محتاج ہوتی ہے اس طرح سے نوکر شاہی کے الجھاؤ اور پبلک کے کاموں مثلاً سیاسی و تجارتی الجھاؤں میں رشتہ ہوتا ہے۔ یہ ایک دوسرے کی زندگی کے لئے لازمی ہوتے ہیں' اس لئے یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ ایک دوسرے پر انحصار کا پھیلاؤ ہر شخص کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس نظام میں حصہ لے اور اس کو مضبوط بنائے۔

سیاستداں

اس حصہ میں ہم صرف ان مقامی سیاستدانوں کا ذکر کریں گے کہ جو کچی آبادی کی ترقی کے پروگرام میں حصہ لیتے ہیں۔ ان کا اور بستی کے والوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ مقامی سیاستداں بستی کے معاملات میں ذاتی مفادات رکھتے ہیں اور بستی کے دلال ان کے موکل ہوتے ہیں' اکثر بستی کے دلال اور سیاستداں ایک ہوتے ہیں۔

سرپرست اور موکل کے نظام میں سیاستداں اس بات کو ترجیح دیتا ہے کہ وہ اپنے موکلوں کو مراعات بخشے' بجائے اس کے کہ ان کے حقوق کے لئے جدوجہد کرے' اگر وہ آج بستی کے لئے پبلک نل حاصل کر لیتا ہے اور دوسری مرتبہ بستی کی ایک سڑک پختہ کروا دیتا ہے تو یہ اس کے لئے زیادہ بہتر ہے کہ وہ ایک ہی مرتبہ میں اپنے گاہکوں کو تمام حقوق دلوا دے' کیونکہ اگر انہیں حقوق مل گئے تو پھر وہ اپنے سیاستدانوں کے کم محتاج ہو جائیں گے۔

اس کے ساتھ ہی سیاستدانوں کی سرگرمیاں عارضی سہولتوں کے حصول کے لئے ہوتی ہیں۔ یہ سیاستداں عام طور پر اس وقت بھی دخل اندازی کرتے ہیں جب کہ حکومت کسی کام کو پورا کر رہی ہوتی ہے' اس کی ایک مثال لیاری کی ہے' کہ جو شہر کے مرکز کی ایک بڑی گندی آبادی ہے' یہاں ۷ لاکھ لوگ رہتے ہیں' اس کو منصوبہ اس وقت بگاڑ کا شکار ہو گیا کہ جب الیکشن مہم کے دوران ایک امیدوار نے پرجوش اور تالیاں بجاتے ہوئے مجمع میں اعلان کر دیا کہ لیز کی شرح ۴ روپیہ فی مربع گز سے زیادہ نہیں ہو گی۔ اس کے بعد میونسپلٹی کے لئے یہ ناممکن ہو گیا کہ اس سے زیادہ قیمت وصول کر سکے' اس کے ساتھ ہی یہ بھی ناممکن ہو گیا کہ ترقی کے منصوبہ پر عمل درآمد ہو سکے۔ اس لئے آخرکار یہ منصوبہ ترک کر دیا گیا۔

عمل درآمد کی خرابیاں

اوپر ہم نے ہر اس گروہ کے مقاصد اور طریقوں کا تجزیہ کیا ہے کہ جو بستی کی ترقی میں حصہ لیتے ہیں' اس وقت ہم نے گروہوں کے تعلقات کو بیان کریں گے۔

اس چارٹ کے تحت دیئے گئے رابطوں کے تحت مندرجہ نتائج کو اخذ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ لیڈروں اور حکومت کے درمیان چاہے کچھ بھی مسائل ہوں' بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ان لیڈروں' بستی والوں اور حکومت کے مفادات آپس میں ملتے ہیں۔ ایک طرف سے تو اس کی وجہ سے ان میں آپس میں بڑا مقابلہ ہو جاتا ہے' دوسری طرف یہ بھی ہوتا ہے کہ ان

گروپوں میں آپس میں معاہدہ ہو جاتا ہے اور اس معاملہ میں وہ پھر بستی کے رہنے والوں کے مفادات کو نہیں دیکھتے۔ وہ بستیاں کہ جن کا وجود بالکل ابتدائی ہوتا ہے وہ اس قسم کے معاہدوں کی اچھی مثال ہیں۔ ایسی بستیاں حکومت کی جانب سے زیادہ سہولتیں اور مراعات حاصل کرتی ہیں۔

۲۔ بستی کے رہنے والوں اور حکومت کے درمیان براہ راست رابطہ نہیں ہوتا ہے، اگرچہ حکومت کبھی کبھی اہم اعلانات کے لئے بستی تک جاتی ہے اور ایسا ہی سیاستداں بھی کرتے ہیں ان دونوں صورتوں میں یہ یکطرفہ معاملہ ہوتا ہے۔ اس کو نظرانداز کرتے ہوئے کہ حکومت کو کیا فنی مشکلات ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ لوگوں کی اکثریت تک نہیں پہنچ سکتی، بستی کے راہنما بھی ان کی بہتر نمائندگی نہیں کرتے، اس کے ساتھ ہی طبقاتی فرق بھی واضح ہو جاتا ہے بڑے افسران متوسط طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں، جب کہ بستی والوں کا تعلق نچلے طبقوں سے ہوتا ہے۔

اس فرق کی وجہ سے آپس میں پوری طرح سے افہام و تفہیم نہیں ہو پاتی۔ اس کے علاوہ قانونی درجہ دینے اور سہولتیں فراہم کرنے پر بستی کے رہنے والوں اور حکومتی اداروں میں تصادم ہوتا ہے اور ان کے درمیان باہمی بداعتمادی قائم رہتی ہے۔ بستی کے رہنے والے حکومتی اداروں کو دشمن تصور کرتے ہیں اور ان کا تصور یہ ہوتا ہے کہ یہ ان کی بستی کو مسمار کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں، یہ ہمیشہ وعدہ کرتے ہیں کہ انہیں رہائشی سہولتیں دی جائیں گی، لیکن ان وعدوں کو کبھی پورا نہیں کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس حکومتی ادارے کچی آبادی والوں کو ناجائز قابض سمجھتے ہیں جنہوں نے نجی یا حکومت کی زمین پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے اور حکومت کی پیشگی منظوری سے پہلے ہی اس پر مکانات تعمیر کر لئے ہیں۔

۳۔ حکومت اور بستی کے رہنے والے ایک دوسرے سے اپنے لیڈروں یا نچلے درجہ کے دلالوں سے براہ راست یا سیاستدانوں اور اونچے درجہ کے دلالوں کے ذریعہ رابطہ قائم کرتے ہیں۔ کم از کم کے۔ ایم۔ سی۔ کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ انفرادی طور پر ہر شخص سے علیحدہ رابطہ قائم کریں اس لئے ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں کہ وہ مقامی جماعتوں اور لیڈروں کے ذریعہ لوگوں تک پہنچیں۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر بتایا ہے بستی کے رہنے والوں اور لیڈروں کے مفادات ہمیشہ ایک جیسے نہیں ہوتے ہیں۔ کبھی یہ لیڈر صرف اپنے حمایتوں کو معلومات فراہم کرتے ہیں اور صرف ان کے مفادات کی نمائندگی

کرتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ سنجیدگی کی بات ہے کہ جو کہ ایک سروے کے ذریعہ معلوم ہوئی ہے، بستی کے رہنے والے لیڈروں کے ذریعہ ترقی کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی ہیں، یہ معلومات ناکافی ہوتی ہیں (اس مقابلہ میں کہ جو کے۔ ایم۔ سی، اخبارات، اور ہمسایوں کے ذریعہ ملتی ہیں) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان حالات میں لیڈر حضرات ایک مقصد کے تحت طرفدارانہ معلومات فراہم کرتے ہیں اور اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ:

صاحب اختیار افسران کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک خلا میں کام کر رہے ہیں اور کبھی بھی لوگوں تک نہیں پہنچ سکیں گے، وہ صرف خاص خاص لوگوں سے رابطہ رکھتے ہیں کہ جو اپنے مفادات کے علاوہ اور کسی کی نمائندگی نہیں کرتے۔

اس آخری عبارت میں اس رابطہ کا ذکر کیا گیا ہے جو حکومت اور سیاستدانوں کے درمیان، اونچے اور نچلے درجہ کے دلالوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کا کوئی نعم البدل نہیں کہ حکومتی اداروں اور لوگوں کے درمیان رابطہ بغیر لیڈروں کے ہو سکے۔ لیڈروں اور افسران میں بھی رابطہ مشکل ہوتا ہے کیونکہ ان دونوں کے درمیان زیادہ طاقت حاصل کرنے کا مقابلہ ہوتا ہے، جیسا کہ لیاری کے سلسلہ میں اوپر بیان کیا گیا ہے۔ ایم۔ احمد نے رابطہ کی ان مشکلات کو جو افسروں اور سیاستدانوں کے درمیان ہیں، اس طرح سے بیان کیا ہے۔

۱۔ نوآبادیاتی دور کی ایک روایت کہ جس میں انتظامیہ کی اعلیٰ حیثیت رہی، اور جس کی وجہ سے قوم پرست راہنماؤں کا ان کی جانب سے مخالفانہ رویہ رہا۔
۲۔ ذہانت اور تجربہ میں افسر، سیاستدانوں سے بڑھے ہوتے ہیں
۳۔ پاکستان میں سیاسی حکومتوں کا غیر مستحکم ہونا

جیسا کہ مندرجہ بالا نکات سے واضح کیا گیا ہے اس میں انتظامیہ کو فوقیت ملی ہوئی ہے، لیکن دیکھا جائے تو سیاستداں کہ جن پر کم ذمہ داری ہوتی ہے وہ انتظامیہ سے زیادہ بہتر کام کر سکتے ہیں۔

ایک اہم مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ عام بستی کے رہنے والوں کے پاس اتنے ذرائع نہیں ہوتے کہ وہ حکومت سے رابطہ قائم کر سکیں۔ اس لئے ایک تنظیم اس رابطہ کی خلیج کو پورا کرتی ہے۔ اس لئے رابطہ بڑی اہمیت اختیار کر لیتا ہے، اگر بستی کی ترقی منظور ہو، تو صرف اس کے ذریعہ بستی والے اپنے حقوق حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ حاصل کرنے کے لئے سرپرستی

کے نظام کو روکنا یا کمزور کرنا انتہائی ضروری ہے' اس کو کس طرح سے کمزور کیا جائے؟ اس کا جواب کچھ یوں ہے کہ "صرف سیاست اور منصوبہ بندی ہی میں نہیں بلکہ معاشی حالات میں فرائض و حقوق کی وضاحت سرپرستی کے نظام کو کمزور کر دے گی۔"

بستی کے رہنے والوں کے حقوق تسلیم کرنے کے دور میں نتائج نکلتے ہیں۔ اس کے لئے رابطہ کے سلسلہ کو زیادہ بہتر اور عمدہ بنایا جا سکتا ہے اور نوٹس بورڈ' پمفلٹ' پریس' اور ریڈیو کے ذریعہ انہیں وضاحت فراہم کی جا سکتی ہیں اور بتایا جا سکتا کہ ان کے حقوق و فرائض کیا ہیں' اور پھر ان کی معلومات کر کے جہاں تک ہو اس پر عمل درآمد کیا جائے۔ اس ذریعہ سے منصوبہ بندی کرنے والے اور انتظامیہ کے لوگ مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ ظاہر ہے کراچی میں یہ صورت حال نہیں اور رابطہ کے لئے درمیان تنظیم کے ذریعہ مقاصد حاصل کرنا وقتی طور پر ایک ذریعہ ہے۔

اس مقالہ کا لہجہ کچھ زیادہ پرامید نہیں ہے' اور نہ میں پرامید ہوں' لیکن تھوڑا سا پرامید ہونے کے لئے مجھے ایک نکتہ پر زور دینے دیجئے جس کی اوپر میں نے وضاحت کی ہے اس پورے منصوبہ میں کہ جس میں کچی آبادی کو ترقی دینے پر عمل کیا جاتا ہے' اس کی خصوصیات ایک جنگل جیسی ہوتی ہیں' یہ شیطان کی سازش نہیں ہوتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگل کے قانون انسانی حقوق کے لئے بہتر نہیں ہوتے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس کو دریافت کروں کہ جنگل میں بھی ایک نظام ہوتا ہے' اور ایک مرتبہ جب ہم یہ جان لیں کہ کن حالات میں جنگل پھیلتا ہے اور بڑھتا ہے' تو پھر ممکن ہو سکتا ہے کہ اس کے پھیلاؤ کو روکا جا سکے۔ مگر یہ ان لوگوں کا کام ہے کہ جو اس کی خواہش رکھتے ہیں۔